ALLAHABAD

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر صرف سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
ششماہی چندہ میں نگار کا جنوری نمبر بہ وجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۳۵ | فہرست مضامین مئی سنہ ۱۹۳۹ء | شمار ۵

ملاحظات ---------- اڈیٹر ---------- ۲
روس کا شاندار مستقبل ---------- 〃 ---------- ۹
انتقادیات ---------- ل۔ احمد اکبرآبادی ---------- ۱۲
اندھی ---------- شنکر سروپ بھٹناگر ---------- ۱۹
ساٹھ سال کے بعد ہماری ادبیات ---------- احمد حسین ---------- ۲۴
عہد تغلق کے سکے ---------- سید محمد رشید گورکھپوری ---------- ۳۲
جنگ آزادی اور مسلمان ---------- گلاب چند ---------- ۲۹
حکومت آصفیہ کی رواداریاں ---------- مہاراجہ بہادر سرکشن پرشاد سابق صدر اعظم دولت آصفیہ۔ ۴۴
مکتوبات نیاز ---------- اڈیٹر ---------- ۵۱
باب الاستفسار ---------- 〃 ---------- ۵۵
آیندہ جنگ اور فضائی قوت ---------- 〃 ---------- ۶۰
کیا آپ کو معلوم ہے ---------- 〃 ---------- ۶۱
نازی لطایف ---------- 〃 ---------- ۷۱
یوروپ کی سیاسیات ---------- 〃 ---------- ۷۲
مطالعۂ فطرت ---------- 〃 ---------- ۷۳

اگر مہینے کے اندر پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع نہ ملی تو دوسری کاپی مفت نہ ملے گی۔

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۳۵	مئی سنہ ۳۹ء ۶	شمار ۵

ملاحظات

ہندوستان کا آیندہ تعلیمی پروگرام

اور

وزیر معارف بہار کی ایک نہایت اہم و برمحل تجویز

ڈاکٹر ذاکر حسین کمیٹی نے جو نصاب تعلیم "ہند جدید" کے لئے تجویز کیا ہے وہ اپنے مقاصد کے لحاظ سے اتنا بلند ہے کہ اس کی مخالفت کا (جس حد تک اغراض و مقاصد کا سوال ہے) کسی طرف سے امکان نہیں، لیکن حصول مقاصد کے ذرایع کے متعلق بیشک اختلاف رائے ہوسکتا ہے اور اس لئے اسوقت اہم ترین سوال یہ ہے کہ ہم اس نصب العین تک جو وارد ھا اسکیم کے پیش نظر ہے کیونکر آسانی سے پہونچ سکتے ہیں

اس باب میں صوبۂ بہار کے وزیر معارف (ڈاکٹر محمود) نے حال ہی میں ایک تجویز پیش کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو وارد ھا اسکیم کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہتا ہے، اس تجویز کی اصابت کے تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا

کمیٹی مذکور نے جو نصاب معاشرتی تعلیم کے لئے مقرر کیا ہے اس کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ بچوں میں اخوت عامہ کا جذبہ پیدا کیا جائے اور "ہند جدید" کے معاشرتی مسایل کو وہ اسی نگاہ سے دیکھنے کے عادی بنائے جائیں، دوسرا مقصد یہ ہے کہ وہ شہری و تمدنی زندگی کے حقوق کو سمجھیں اور انفرادی و اجتماعی حیثیت سے ایک قابل اعتماد رفیق اور پڑوسی بن سکیں۔ مدعا یہ کہ تمام مذاہب عالم کا احترام کرتے ہوئے وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا سیکھیں اور ہندوستان کے موجودہ نسلی، قومی، مذہبی اور معاشرتی اختلاف کو مٹا کر ملک و وطن کے سچے فرزند بننے کی کوشش کریں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جس کی طرف کارکنان وارد ھا اسکیم کو توجہ کرنا ہے، تاریخ ہند کا مسئلہ ہے اور ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے مقالہ میں زیادہ تر اسی مسئلہ پر زور دیا ہے اور ان کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اسوقت تک تاریخ ہند کی جتنی کتابیں طلبہ کے سامنے پیش کی گئی ہیں وہ اجتماعی و اتحادی نقطۂ نظر سے سخت نقصان رساں ہیں اور ان کی تالیف کا مقصود سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کو تباہ کر کے برطانوی شہنشاہیت کے قیام کو مستحکم کریں۔ اس لئے سب سے پہلے ہمیں اسی طرف توجہ کرنا چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ:۔

"مجھے اس کا احساس ہے کہ موجودہ قومی اور سیاسی کشمکش میں جس چیز کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں اس کی ابتدا کرنا آسان نہیں اور ہندوستان جیسے بڑے ملک کی ہزاروں سال کی تہذیب و تمدن کی تاریخ کی چھان بین میں اقتصادی مشکلات بھی سامنے آئیں گی۔ بے لاگ محققین اور تاریخ معاشرت سے دلچسپی رکھنے والوں کی کمی بھی سنگ راہ ہوگی۔ لیکن چونکہ ہم کو وارد ھا اسکیم پر کاربند ہونا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے جہاں تک ہو سکے ہم اس مقصد کی تکمیل کے لئے آسانیاں فراہم کریں۔

اس لئے میں چاہتا ہوں اگر پوری اسکیم پر سر دست عمل درآمد نہ کیا جا سکے تو کم از کم مسلمانوں کے دور حکومت کے متعلق اجتماعی و تمدنی تاریخ کا مواد فراہم کرنے کی کوشش شروع کر دی جائے۔ اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارا موجودہ ہندوستان اُس اجتماعی تہذیب و تمدن کا ورثہ ہے جس میں ہندو مسلمان دونوں نے برابر کا حصہ لیا ہے ..... آج جس چیز کا نام ہندوستانی تہذیب ہے وہ دراصل ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی ... تہذیب کا دوسرا نام ہے اور بہتیرے ہندو مسلمان مفکروں کے دماغ کا نچوڑ ہے لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ آج کل ہماری سیاسی تاریخ سے اس چیز کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ہندوستانی سوسائٹی نے مادی و روحانی دونوں اعتبار سے ہم آہنگی

پیدا کرلی تھی - اور اسی لئے ہندؤں نے بیرونی حملہ آوروں کے روکنے کے لئے مسلمانوں کا ساتھ دیا (۱۸۵۷ء) اور آج بھی برطانیہ کے خلاف جو جدوجہد ہو رہی ہے وہ اسی ہندو مسلم تہذیب کے اختلاط کا نتیجہ ہے - الغرض ہم لوگوں کو اسلامی دور حکومت کا صحیح تاریخی مواد فراہم کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ وہ تاریخی لٹریچر جو برطانیہ کی سرکردگی میں تیار کیا گیا ہے اس میں مسلمانوں کے دور حکومت کے متعلق نہایت گمراہ کن غلط بیانیوں سے کام لیا گیا ہے اور برطانیہ کی اس پالیسی سے ہماری معاشرتی و سیاسی ترقی کو سخت نقصان پہونچا ہے -

اس نوع کی تاریخی کتابوں میں سر ایچ - ایم - الیٹ کی تصنیف بڑا زبردست کارنامہ سمجھا جاتا ہے اور شاید ہی کوئی مورخ ایسا ہو جس نے اس تاریخ سے استفادہ نہ کیا ہو اور اس شہنشاہیت پرست مورخ نے نہایت چالاکی کے ساتھ اپنے مواد کو مرتب کرکے پڑھنے والوں کو یہ نتیجہ اخذ کرنے کی رہنمائی کی ہے کہ برطانوی حکمرانوں نے اپنی حکومت کے نصف صدی کے اندر قوم کی اصلی فلاح و بہبود کے لئے اس سے بھی زیادہ کیا ہے جو اگلے فرمانرواؤں نے دس گنا زیادہ زمانہ میں کیا تھا -

اس کا مقصود صرف یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان ہر ممکن اختلاف پیدا کیا جائے اور جو مواد اسنے جمع کیا وہ ایسا تھا جس سے اس باہمی منافرت کو قوی بنایا جائے - چنانچہ مسلمان بادشاہوں - کے عہد میں ہندؤں کی حالت کے متعلق جو عمومی تبصرہ اس نے کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :-

" اس کتاب میں جو چند اقتباسات پیش کئے گئے ہیں، ان سے پتہ چلیگا کہ مسلمانوں نے کتنے ہندو مارے - جلوس، پوجا اور اشنان کے خلاف رکاوٹیں پیدا کیں، - مسلمان مورتیوں کو توڑتے تھے، مندر تباہ کرتے تھے - تبدیل مذہب اور شادی کے لئے مجبور کرتے تھے - جاگیریں اور جایدادیں ضبط کرلی جاتی تھیں، خونریزی اور قتل کی گرم بازاری تھی"

چونکہ الیٹ تاریخی صداقت کی بھینٹ چڑھاکر برطانوی حکومت کے استحکام کے لئے کوشش کر رہا تھا اس لئے اس نے کھلم کھلا تاریخ ہند کے اس خد و خال کو بگاڑ دیا جو اس کے خاص موضوع کے ناموافق تھا، اندریں حالات میری رائے یہ ہے کہ ہمیں فوراً ایک ایسے ادارہ کی بنیاد ڈالدینا چاہئے، جو ہندوستان کی اجتماعی و تمدنی تاریخ کی تعمیر جدید کے لئے مواد فراہم کرنا شروع کردے - یہ مواد ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد حکومت سے متعلق ہوگا اور یہ ادارہ گویا اس قومی عظیم الشان مجلس کا ایک جزو ہوگا، جو آیندہ چلکر قایم ہونے والی ہے، فی الحال ہم لوگوں کو ایک کمیٹی قایم کرنی چاہئے - جو اسلامی حکومت کے عہد سے قبل اور برطانوی دور سے متعلق کام کرنے پر غور و خوض کرے، ہمیں قصوں اور کہانیوں کے ایک ماہر کا بھی تقرر کرنا چاہئے جو وسیع پیمانہ پر قصوں کہانیوں کے سلسلہ میں ابتدائی کام شروع کردے - ایک کمیشن قایم کرنا چاہئے جو ایک

مرکزی لائبریری اور عجائب خانہ کے قیام کا ڈھانچہ تیار کرے۔ اس بورڈ (ادارہ) کا کام یہ ہوگا کہ وہ مسلمانوں کے دور حکومت کے متعلق مواد کی فراہمی، ترتیب و اشاعت کا کام کرے۔ اس کی تکمیل میں تقریباً تین سال صرف ہوں گے، ادارہ میں چار اڈیٹر ہوں گے ایک مغلوں سے قبل زمانہ کے لئے، دوسرا عہد مغلیہ کے لئے تیسرا دکنی اور صوبجاتی تمدن کے مطالعہ کے لئے اور چوتھا مسلمانوں کی حکومت کے متعلق خصوصیت کے ساتھ ہندو ماخذ سے استفادہ کرنے کے لئے۔ علاوہ ان کے بارہ ریسرچ اسکالر (تحقیق و تفتیش کرنے والے علما) کی ایک کمیٹی بھی ہونی چاہئے جو ایک ناظم کے ماتحت کام کرے گی۔ ان تحقیق کرنے والے علماء میں دو عہد مغلیہ سے قبل کے واقعات اور تین دور مغلیہ کے متعلق تحقیق و مطالعہ کریں گے اور دو دکن کے اسلامی دور حکومت کے متعلق معلومات فراہم کریں گے، دوسرے دو اسکالر مخصوص طور پر ہندو مصنفوں کی تحریروں کی مدد سے مسلمانوں کے عہد حکمرانی کا مطالعہ کریں گے۔ چونکہ باکی پور لائبریری میں مشرقی مخطوطات کا لاجواب ذخیرہ موجود ہے اس لئے اس کا مرکزی دفتر پٹنہ میں ہوگا اور نایاب قلمی کتابوں کی تصویریں حاصل کرنے اور اُن قلمی کتابوں کے مطالعہ کے لئے بھی جو مختلف ہندوستانی اور غیر ملکی لائبریریوں میں پائی جاتی ہیں، انتظامات کئے جائیں گے۔ آئندہ چلکر انگریزی اور دوسری مشہور ہندوستانی زبانوں میں اس مواد کی اشاعت کے لئے انتظامات کرنا پڑیں گے۔ ابتدائی کام یہ ہوگا کہ عہد زیر بحث کے متعلق ادبیات کا مفصل ماخذ تیار کر دیا جائے۔ اور مضامین کی ایک فہرست مرتب کی جائے جس کی روشنی میں مجلس تحقیق (ریسرچ کمیٹی) کے اراکین مواد فراہم کریں۔ اڈیٹروں کا مواد کے ماخذ سے پوری طرح واقف ہونا اور اراکین مجلس تحقیق کا علمی تحقیق کے جدید طریقوں اور زبانوں سے جن میں مواد پائے جاتے ہیں مطلع ہونا ضروری ہے۔ وقتاً فوقتاً کام کی ترقی کے متعلق اطلاع دینے کے لئے ایک مجلس شوریٰ (Advisory Committee) بنائی جائے۔ جس میں ان تمام حکومتوں سے جو اس تجویز کے ساتھ موالات کریں گے ایک ایک رکن کے نامزد کرنے کی درخواست کی جائے گی۔ تین سال تک اس ادارہ کے مصارف امتحاناً یوں ہوں گے۔

چار اڈیٹر	ماہانہ فی کس	۵۰۰ روپیہ	۲۰۰۰، روپیہ تین سال کے لئے
ایک انگریزی مترجم	〃	۳۵۰ 〃	۱۲ر۶۰۰ 〃
۱- سکریٹری	〃	۵۰۰ 〃	۱۸ر۰۰۰ 〃
۱۲ ارباب تحقیق (ریسرچ اسکالر)	〃	۱۲۵۰ 〃	۱ر۸۰۰
۳ کاتب	〃	۴۰ 〃	۴ر۳۲۰ 〃
۱ ٹائپ کرنے والا	〃	۴۰ 〃	۱ر۴۴۰ 〃
۲ منشی	〃	۳۰ 〃	۲ر۱۶۰ 〃

۱ چپراسی	ماہانہ فی کس ۱۵ روپیہ	۱۸۰ روپیہ تین سال کے لئے
۱ دفتری	" ۱۰ "	۳۶۰ "
کرایہ وروشنی	" ۱۰۰ "	۳۶۰۰ "

کتب ماخذ کی ترتیب دینے کے ابتدائی کام میں تقریباً چھ ماہ کی مدت صرف ہوگی، اور تقریباً تین ہزار روپیہ خرچ ہوں گے۔ تین ہزار دفتر کی درستگی اور مزید چالیس ہزار اڈیٹروں اور اسکالروں کے خرچ سفر اور مخطوطات کی نقل وفوٹو لینے کے عارضی کاموں کے سلسلہ میں صرف ہوں گے، اس طور سے مجموعی خرچ تقریباً دو لاکھ ہوگا۔ فراہم کئے ہوئے مواد کی عدم موجودگی میں انگریزی اور ہندوستان کی دوسری معروف زبانوں میں اشاعت کا تخمینہ مشکل ہے، اس طرح سے مواد فراہم کرنے اور ان کے انگریزی ترجمہ کی تجویز پر تخمیناً سرکار کے تقریباً دو لاکھ یا سالانہ تقریباً ۶۶۷۰۰ روپے تین سال کی مدت تک صرف ہوں گے"۔

یہ ہے وہ مفید تحریک جس کو صوبۂ بہار کے وزیر معارف عملی صورت میں لانا چاہتے ہیں اور جس کی تکمیل کے لئے ہر طرح کی سعی کرنا ہمارا اخلاقی، انسانی، اجتماعی اور سیاسی فرض ہے۔

جو حضرات اس باب میں زیادہ تفصیلات حاصل کرنا چاہتے ہیں یا کوئی مفید مشورہ دے سکتے ہیں انھیں براہ راست ڈاکٹر محمود وزیر معارف صوبۂ بہار سے خط وکتابت کرنا چاہئے۔

گاندھی وبوس کی جنگ

آخر کار گاندھی جی کے سامنے مسٹر بوس کو سپر ڈال دینا ہی پڑی اور غالباً تاریخ کانگرس میں یہ بالکل پہلا واقعہ ہے کہ کسی صدر نے کثرت رائے سے منتخب ہونے کے بعد اپنے آپ کو اس قدر مجبور پایا ہو کہ استعفا دینا اس کے لئے ناگزیر ہو جائے۔

مسٹر بوس کا انتخاب صدارت کیونکر عمل میں آیا، گاندھی جی یا (زیادہ صحیح تعبیر کے ساتھ) مسٹر پٹیل نے کیوں ان کی صدارت کو پسند نہیں کیا اور پھر اس کے ختم کرنے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کی گئیں، ان میں سے کوئی بات اب راز محفل نہیں ہے اور ہر وہ شخص جو موجودہ سیاسیات میں کچھ بھی درک رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ جنگ گاندھی اور بوس کی نہیں تھی بلکہ ان دو جماعتوں کی تھی جن میں سے ایک برطانوی قیادت وسرمایہ داری کی حامی ہے اور دوسری وہ جو یہاں کا نظم ونسق یکسر اجتماعی یا اشتراکی اصول پر چاہتی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ کانگرس کی یہ دونوں جماعتیں اپنے اپنے جذبات کو دبائے ہوئے کچھ دن اور صلح وآشتی کی زندگی بسر کر لیجاتیں، لیکن فیڈریشن کے مسئلہ نے دونوں کے چہرہ سے نقاب الٹ دیا اور گاندھی وبوس کے خط وخال حقایق کی روشنی میں آگئے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ گاندھی پارٹی، خواہ وہ فیڈریشن کی کتنی ہی زبانی مخالفت کرے لیکن اندرونی

طور پر فیڈریشن کو منظور کر لینے کا فیصلہ کر چکی ہے اور برطانوی حکومت کو اس کا یقین دلایا جا چکا ہے اسی طرح یہ بھی یقینی ہے کہ بوس اور ان کی جماعت قبول وفاق کی سخت مخالف ہے اور وہ کسی قیمت پر بھی یہ سودا کرنے کے لئے طیار نہیں۔ پھر سالِ رواں میں جبکہ قبولِ وفاق کے تمام اُصولی مراحل طے ہو جاتا ہیں، گاندھی پارٹی کیونکر بوس کی صدارت کو گوارا کر سکتی تھی اور بوس کے ہوتے ہوئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ کانگرس برطانوی شہنشاہیت سے ساز باز کرنے میں کامیاب ہو سکتی۔ بہر حال اگر یہ جنگ حق و باطل کی جنگ رہی ہو تو بھی باطل کا حق پر غالب آجانا تاریخ کا کوئی نیا واقعہ نہیں اور اگر حامیانِ حق ہمت نہ ہاریں تو آخر کار انکا کامیاب ہو جانا بھی کوئی حیرت کی بات نہ ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ اسوقت سوشلسٹ جماعت کا ستارہ زوال پذیر ہے اور جب پنڈت جواہر لال ایسا انسان جس کے رگ و ریشہ میں کارل مارکس اور لینن کی روح دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی گاندھی و پٹیل کی سرمایہ دارانہ پالیسی کے سامنے سرنگوں ہو جائے، تو اس کو اشتراکیت پسندوں کی انتہائی بدنصیبی سمجھنا چاہیئے لیکن جب کوئی ملک انقلاب کی راہوں سے گزرتا ہے تو ایسے نشیب و فراز بارہا اس کے سامنے آتے ہیں، بہت سے پرانے رفقاء ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، بہت سے نئے پیدا ہو جاتے ہیں، لوگ گر گر کر سنبھلتے ہیں، سنبھل سنبھل کر گرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بڑھنے والے بڑھتے رہتے ہیں اور آخر کار منزلِ مقصود تک پہونچ جاتے ہیں۔

اس لئے سوشلسٹ جماعت کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، آج نہیں تو کل وہ وقت آئے گا جب گاندھی اور پٹیل سے زیادہ جرأت آزما لوگ آزادی کا مفہوم متعین کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور حزم و احتیاط کا یہ دور ختم ہو کر جان پر کھیل جانے کا وہ زمانہ آکر رہیگا، جب مزدور کی کُدال سے خون ٹپک رہا ہوگا اور زندگی کی راہیں سرمایہ داری کی لاش سے گزر کر استوار کی جائیں گی۔

لکھنؤ کی سُنّی شیعہ نزاع

آخر کار مدح صحابہ کا جلوس نکل کر رہا اور شیعوں کی یہ کوشش کہ حکومت اپنی اجازت کو واپس لینے کا میاب ثابت نہ ہوئی۔ پھر ہو سکتا ہے کہ سُنّی اس کو اپنی کامیابی تصور کریں، لیکن میرے نزدیک اسلام و اصولِ اسلام کی جتنی شکست اس میں پنہاں ہے اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔

سُنّیوں کو اجازت ملتی ہے کہ وہ سال میں صرف ایک دن مدح صحابہ کا جلوس نکال سکتے ہیں اور وہ بھی اُن راہوں سے جن کا تعلق شہر کی آبادی سے بہت کم ہے اور اِس محتاط خوف کے ساتھ کہ فوج اور پولیس کی سنگینیں اس کا محاصرہ کئے ہوئے ہوں۔ لیکن سنی خوش ہیں کہ ان کی ضد پوری ہوئی، اور

شیعوں نے مقابلہ میں وہ کامیاب رہے۔

شیعوں میں تبرا کی تحریک بدستور قایم ہے، وہ روزانہ "لعنت برزباں" و "کف دردہاں" سیکڑوں کی تعداد میں امام باڑہ سے نکلتے ہیں اور گرفتار ہو رہے ہیں۔ ان کا مطالبہ ہے کہ اگر مدح صحابہ کی یہ اجازت یکروزہ واپس نہیں لیجا سکتی تو انھیں بھی "جلوس تبرا" نکالنے کی پروانگی عطا کی جائے۔ اور اگر اسکی اجازت انھیں مل گئی تو وہ بھی مطمئن ہو جائیں گے اور اس طرح "مدح و قدح" کا یہ فتنہ دونوں جماعتوں کو ہمیشہ کے لئے جدا کر دیگا۔ کہنے والے کہتے ہیں مدح صحابہ کا جلوس نکالنے کی اجازت ہی حکومت نے اس لئے دی تھی کہ مسلمانوں میں باہمد گر تفریق ہو جائے، لیکن میں اس کو صحیح نہیں سمجھتا، البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اس اجازت میں اس نے اپنی دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا اور ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہ اپنی اس اجازت کو واپس لیلے، لیکن غالباً یہ اسکی دوسری حماقت ہوگی۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ وہ اس سلسلہ میں اور کتنی غلطیوں کی مرتکب ہو۔

اب اس سوال کی نوعیت یقیناً مذہب سے متعلق نہیں رہی بلکہ جماعتی خودداری اور قومی عزت سے وابستہ ہو گئی ہے۔ یعنی اگر شیعہ اس وقت ستیاگرہ کر رہے ہیں تو محض اس لئے کہ ان کی غیرت قومی اس پر مجبور کر رہی ہے اور اگر سُنّی "ارتفاعِ اجازت" کو گوارا نہیں کر سکتے تو صرف اس بنا پر کہ وہ اسے اپنی جماعت کی شکست سمجھتے ہیں۔ اس لئے یقیناً حکومت کے اختیار سے باہر ہے کہ وہ ان دونوں جماعتوں کو مطمئن کر سکے اور اندریں صورت شیعہ سنی دونوں کی انتہائی حماقت ہے کہ وہ اس کا علاج حکومت سے چاہتے ہیں۔ یہ فتنہ خود انھیں کا بپا کیا ہوا ہے اور انھیں کو اسے ختم کرنا پڑیگا اور اگر وہ فرو کرنا نہیں چاہتے تو پھر دنیا کی کوئی تدبیر اس کو فرو نہیں کر سکتی۔

سُنّیوں کو مدح صحابہ سے کبھی باز نہیں رکھا گیا، وہ اپنے گھروں میں، جلسوں میں فضایل صحابہ ہمیشہ بیان کر سکتے ہیں، اس لئے جلوس نکالنے پر اصرار کرنا یقیناً ایک فتنہ بپا کرنا ہے جس سے ان کو باز رہنا چاہیئے، اسی طرح شیعہ حضرات اپنے گھروں میں اپنی مجالس میں تبرا پڑھنے کے لئے آزاد ہیں اور ان کو اسکے اعلان پر اصرار کرنا بلاشبہ فساد کی بات ہے جس سے ان کو بچنا چاہیئے۔ عقایدی حیثیت سے تو یہ جنگ کبھی ختم نہیں ہو سکتی، لیکن معاشرتی، اجتماعی و سیاسی حیثیت سے اسکو یقیناً ختم ہو جانا چاہیئے اور اس کا ختم کرنا انھیں کے اختیار کی بات ہے بشرطیکہ رواداری و ایثار سے کام لیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ جب رواداری کا سوال سامنے آتا ہے تو توقع یہی کیجاتی ہے کہ دونوں فریق اس جذبہ سے کام لیں ... لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صرف ایک ہی فریق کے جھکنے سے کام نکل جاتا ہے اور اس لئے میری رائے یہی ہے کہ اگر شیعہ رواداری سے کام نہیں لیتے، تو سنیوں کو ایک بڑی جماعت ہونے کی حیثیت سے ایثار کرنا چاہیئے اور انھیں اعلان کر دینا چاہیئے کہ وہ آیندہ مدح صحابہ کا جلوس نہیں نکالیں گے۔ پھر اسکے بعد بھی اگر حضرات شیعہ (یہ جانتے ہوئے کہ تبرا کے اعلان کی انکو اجازت کبھی نہیں مل سکتی) اعلانِ تبرا پر اصرار کریں گے تو یہ انکا ایسا فعل ہوگا جسکی ذمہ داری قطعاً سنیوں پر نہ ہوگی اور حکومت کو اختیار ہوگا کہ وہ جو تدبیر مناسب سمجھے عمل میں لائے

روس کا شاندار مستقبل

(عہد اسٹالین میں)

گزشتہ جنگ عظیم دوز بردست انقلاب پر ختم ہوئی ایک انقلاب جرمنی، دوسرا انقلاب روس لیکن یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایک ہی ذریعہ سے دو پیدا ہونے والی چیزیں آپس میں قطبین کا سا بُعد و اختلاف رکھتی ہیں۔

ایک جگہ پابندی و زبان بندی کا یہ عالم کہ بات کرتے زبان کٹتی ہے اور دوسری جگہ آزادی کی یہ شدت کہ خدا و مذہب بھی بالائے طاق رکھدئے گئے۔ ترقی کے آثار دونوں جگہ پائے جاتے ہیں، لیکن ایک جگہ وہ "استحصال بالجبر" کی صورت رکھتی ہے اور دوسری جگہ فطری نشو و نما کی۔ ہٹلر کا جرمنی تیغ و تفنگ سے امن کو برباد کرنا چاہتا ہے اور بالشیوک روس عام اقتصادی اصلاح کی بنا پر ایک پایدار سکون کا متمنی ہے

زار کے قتل کے بعد سے اسوقت تک جو جو تغیرات روس میں ہوئے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصل مقصود انسانیت کو کرب و تکلیف سے آزاد کرانا ہے خواہ اس مقصود کا نام آپ اشتراکیت رکھیں یا کچھ اور۔ اصل چیز وہ تدابیر ہیں جن سے یہ مقصود حاصل ہو سکتا ہے اور روس ان کو کسی خاص نام سے موسوم کرنے پر مصر نہیں ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اول اول جس روس کو کعبۂ اشتراکیت کہا جاتا تھا اور جس کا مقصود دنیا میں نشر اشتراکیت تھا، اب وہ اپنے اصول تبلیغ کو ترک کر چکا ہے، یعنے اُس کو اس سے کوئی واسطہ نہیں کہ دنیا میں جمہوریت پھیل رہی ہے یا ملوکیت، نازیت کا زور ہے یا فسطائیت کا وہ تو اب یہ چاہتا ہے کہ اُسے اپنے ملک کے ذرایع ترقی سے کام لینے کے لئے آزاد و تنہا چھوڑ دیا جائے نہ وہ کسی سے لڑنا چاہتا ہے نہ کسی کے ساتھ اخلاقی ہمدردی کر کے وہ اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا کرنے پر راضی ہو سکتا ہے۔

چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس پالیسی نے روس کے قوائے عمل میں کتنی زبردست حرکت و عمل کی کیفیت

پیدا کردی ہے۔ وہاں نئے نئے شہر تعمیر ہو رہے ہیں، ہر جگہ بڑے بڑے کارخانے قایم کئے جا رہے ہیں وہ دولت جو صدیوں سے برفستانی علاقوں میں زیر زمیں چھپی ہوئی تھی اسے کھود کھود کر باہر نکال رہے ہیں اور شاید یہ سنکر تعجب ہوگا کہ اس میں بڑا حصہ عورتوں کا ہے کیونکہ روس کی قوت عاملہ میں ۳۵ فی صدی عورتوں کی جماعت کام کر رہی ہے۔

انقلاب کے بعد روسی عورتوں کے متعلق عجیب و غریب روایات سننے میں آتی تھیں۔ انکی حیثیت "اشتراکی بیوی" کی سی تھی یعنی ان کے بچے چھین کر اشتراکی پرورشگاہوں میں رکھے جاتے تھے اور اپنے والدین کو کبھی نہ دیکھ سکتے تھے، گویا روس ایک آزاد اور بے لگام محبت کی سرزمین تھی، لیکن اب صورت حال کچھ اور ہے اور مستحکم ازدواجی تعلقات کی اہمیت پھر عود کر آئی ہے۔ وہاں کوشش کی جا رہی ہے کہ کثرت اولاد سے ہر خاندان کو وسیع بنایا جائے اور جب کوئی مزدور عورت حاملہ ہوتی ہے تو ولادت سے دو ماہ قبل اور دو ماہ بعد پورے چار مہینے کی رخصت پوری تنخواہ یا اُجرت پر دیدی جاتی ہے۔

زار کے زمانہ میں زچہ گاہوں کے اندر صرف ۵۵۰ عورتوں کی گنجایش تھی، لیکن اب وہاں ۱۳۰۰۰ بستر نظر آتے ہیں اور سوویٹ بچوں کے لئے ۱۱۵۰۰ ادارے دودھ فراہم کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گزشتہ سال وہاں ۳۵ لاکھ بچے پیدا ہوئے اور یہ سب اچھی صحت رکھتے تھے۔

اول اول اسٹالین نے عورتوں کو سرخی اور غازہ ملنے کی ممانعت کر دی تھی لیکن اب یہ پابندی بھی اُٹھ گئی ہے اور وہاں کی عورت اپنی وضع و قطع کے لحاظ سے ویسی ہی نظر آتی ہے جیسے یوروپ کے کسی دوسرے ملک کی۔

روس کی لمبائی بہت ہے اور ایک اکسپریس کو دس دن اس کے طے کرنے میں لگتے ہیں لیکن چوڑائی بہت کم ہے اور قطب شمالی سے انتہائی جنوبی علاقہ صرف ۱۲۲۱ میل ہے۔ جس کی ایک ایک انچ زمین سے اسٹالین کام لینا چاہتا ہے۔

اس نے اس برفانی علاقہ میں ۴۰ نئے شہر بسائے ہیں جن کی آبادی ایک ایک لاکھ سے زیادہ ہے اور ان کے علاوہ اور جدید شہر زیر تعمیر ہیں۔ یہاں موسم سرما میں نہایت تیز سرد طوفانی ہوا چلتی ہے جو ہر چیز کو ٹھٹھرا دیتی ہے لیکن روسی سائنس دانوں نے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے مصنوعی آفتاب بجلی کی مدد سے طیار کئے ہیں جو ہر گھر کو گرم رکھتے ہیں اور نلوں سے گرم پانی مہیا کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ بڑی بڑی نہریں کھودی جا رہی ہیں اور سال کے اخیر تک اس برفانی علاقہ سے بحر اسود اور بحر روم تک جہازوں کی آمد و رفت شروع ہو جائے گی اور اس طرح ماسکو کا تعلق پانچ سمندروں سے ہو جائے گا۔

وہاں نئی نئی عمارتیں بھی کثرت سے بنائی جا رہی ہیں۔ کارخانے شہر سے باہر اور سکونتی مکانات ساحلوں پر

تعمیر ہو رہے ہیں۔ ماسکو کے جنوب میں جو سلسلہ پہاڑیوں کا ہے وہاں سے تمام کارخانے ہٹا کر سکونتی مکان تعمیر کرا دئے گئے ہیں اور وسط میں ہر قسم کی تفریح گاہیں بنا دی گئی ہیں۔ چھ بجلی گھر نئے تعمیر کئے گئے ہیں جو مکانوں میں گرمی اور روشنی پہونچاتے ہیں۔ گرم پانی بھی تمام گھروں میں انھیں کے ذریعہ سے فراہم کیا جاتا ہے۔

چار مرکزی مطبخ بھی بنائے گئے ہیں، جو ہر گھر میں کھانا پہونچا سکتے ہیں۔ ٹیلی فون اور ہوائی نلوں کے ذریعہ سے ایک ڈبہ کے اندر بند گرما گرم کھانا گھر میں پہونچ گیا۔ یہاں ایک بہت بڑا قصر "قصر سوویٹ" کے نام سے طیار ہو رہا ہے، یہ دنیا کی سب سے بڑی عمارت ہوگی۔ اس کے درمیانی کمرے میں ۲۰ ہزار آدمیوں کی جگہ ہوگی اور ۲۰۰ مرفاع ( ) نصب کئے جائیں گے۔ اس کی چوٹی پر لینن کا بُت قایم کیا جائے گا جو ۳۲۸ فٹ اونچا اور ۵۰۰ ۴ ٹن وزنی ہوگا، اس بُت کی اُنگلی (انگوٹھے کے پاس کی) ۶ گز سے زیادہ لمبی ہوگی۔ یہ عمارت گویا یادگار ہوگی اس بات کی گزشتہ ۲۱ سال میں روس نے کتنی ترقی کی۔ اس یادگار عمارت کی بلندی ۱۳۰۰ فٹ ہوگی، حالانکہ فرانس کا برج ایفل جو دنیا کا سب سے بلند برج ہے صرف ۹۸۴ فٹ اونچا ہے۔

زراعت اور جنگل کی طرف روس کو بہت توجہ ہے دنیا کی تمام صحرائی پیداوار کی نصف روس کے جنگلوں میں پائی جاتی ہے جن کا رقبہ ۱۹ لاکھ مربع میل ہے اور یہیں کے جانوروں سے سمور فراہم کیا جاتا ہے۔ روس میں جہاں کہیں جنگل نہیں ہے، سیاہ زمین ہے جو عام زمینوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ پیداوار کی اہلیت رکھتی ہے۔ اس زمین میں سال کے اندر تین فصلیں گیہوں کی کاشت کی جاتی ہیں جہاں روئی، چاول اور ترشاپھی بہت پیدا ہوتا ہے آیندہ سال کے اختتام تک ربر کی کاشت بھی وہاں شروع ہو جائے گی اور جرمنی کی طرح وہ مصنوعی ربر کا محتاج نہ رہیگا۔ زراعت کو وسیع و زرخیز بنانے کے لئے وہاں تمام جدید علمی طریقے استعمال کئے جا رہے ہیں، چنانچہ کھیتوں سے جراثیم دور کرنے کے لئے وہاں سیکڑوں ہوائی جہاز قاتل جراثیم دوائیں چھڑکتے رہتے ہیں، بڑی کوشش کی جاتی ہے کہ جنگل میں آگ نہ لگنے پائے، چنانچہ وہاں کے صحراؤں میں بڑے بڑے لاسلکی برج بنے ہوئے ہیں جو آگ لگتے ہی فوراً خبر کر دیتے ہیں اور ہوائی جہاز متاثر رقبہ کے چاروں طرف حلقہ کر کے آگ بجھانے والی گیس پھیلا کر اس کو ختم کر دیتے ہیں۔

دُنیا میں جتنی تیل کی پیداوار ہے اس کی نصف سے زیادہ روس سے نکلتی ہے، اس وقت وہاں ۴۵ تیل کی کانوں میں کام ہو رہا ہے، لیکن ۸۰ کانیں اور زیر تجربہ ہیں۔ امریکہ کے بعد روس ہی وہ ملک ہے جہاں سب سے زیادہ کویلہ پیدا ہوتا ہے اسی طرح لوہا سالگزشتہ ساڑھے دس ملین ٹن روس کے کانوں سے برآمد کیا گیا۔ یہی حال تانبہ اور الومنیم کا ہے۔

اسٹالین کہتا ہے کہ "صرف کوہستان یورل میں جتنی دولت چھپی ہوئی ہے اتنی ساری دنیا میں نہیں پائی جاتی"۔ اور اس میں شک نہیں کہ روس اپنی اسی دولت سے فایدہ اُٹھانا چاہتا ہے اور وہ بحالات موجودہ کسی جنگ میں حصہ لیکر اپنی ان توقعات کو خاک میں ملانے کے لئے آمادہ نہیں۔

انتقادیات

(مابعدِ ارسطو)

نقدِ ادب کی کوئی مسلسل تاریخ پیش کرنا نہ ضروری ہے نہ آسان۔ کیونکہ یورپ کی دیگر زبانوں سے قطعہ نظر صرف انگریزی ادب ہی کے متعلق اگر اُن تمام ادیبوں اور مصنفین کی رائے ظاہر کی جائے جن کو نقدِ ادب میں نمایاں شہرت حاصل ہے، تو بھی ایک دشوار کام ہوگا کیونکہ حقیقتاً نقدِ ادب اکثر صورتوں میں اتنی ہی انفرادی چیز ہے جتنی کہ تخلیقِ ادب اور نقدِ ادب کی کامیابی کسی فلسفیانہ اُصول کی محتاج نہیں۔ اب آیئے تاریخِ انتقاد کے متعدد رجحانات پر مختصر تبصرہ کریں اور تنقید میں جو بعض اہم اضافے ہوئے ہیں ان کو مجملاً واضح کردیں۔

ایسے نقادوں میں جو نقدِ ادب میں ایک طریقِ کار کے مالک تھے، ہوریس (Horace) کو نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ گو وہ اپنے نظریہ کی توضیح کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا اور وہ اسکو کافی سمجھتا ہے کہ اپنے بنائے ہوئے قواعد پیش کردے۔ اُس کی تصنیف "فنِ شعر" (Art Poetica) جس نظرئے کو پیش کرتی ہے وہ فی الحقیقت ارسطو کا نظریہ ہے، گو ہوریس اس نظریہ کو فلسفہ کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اس کے عملی ہونے کے سبب سے پسند کرتا ہے۔ اُس نے اُس نظریہ کو اس وجہ سے اختیار کیا ہے کہ ایک نقاد کی حیثیت سے اُس کو استعمال کرے۔ چنانچہ اُس کی اس نظم کو کسی حال میں ایک استدلال کا درجہ نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس کو مشوروں اور ہدایتوں کا ایک ایسا مجموعہ کہا جائے گا جو عجلت میں مرتب کیا گیا ہو اور جن کے اندر ربط و مطابقت کی نوعیت منطقی ہونے کے بجائے شاعرانہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی یہ تصنیف کوئی انتقادی تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ ایک نظم ہے، جس کا موضوع انتقادِ ادب ہے اور اُس نظم کی صناعی (Work manship) سے جتنا کچھ سیکھا جا سکتا ہے اتنا اُس کی ہدایات سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے ادب میں شاید ہی کوئی دوسری نظم ایسی ملے جس کے جملے اس قدر کثرت سے بین الاقوامی ثقافت کا جزو بن گئے جتنے کہ ہوریس کی اس نظم کے۔

ہوریس کہتا ہے کہ ایک کردار کو ہمارے اُس علم کے مطابق ہونا چاہئے جو زندگی کے متعلق ہم کو حاصل ہے یعنی ایک کردار اُس عہد سے مطابقت رکھتا ہو جس زمانے کے کردار کو پیش کیا جا رہا ہے۔ "فن شعر" کی بابت اس کا خیال وہی ہے جو ارسطو کی "شعریات" میں نظر آتا ہے یعنی اُصولِ وحدت ہوریس حقیقی وحدت کو مانتا ہے۔ وحدت کا یہ اُصول جو وحدتِ عمل کے نام سے معروف ہوا، اُس کو ہوریس وحدتِ جوہر (Substance) وحدتِ حال (Mood) اور وحدتِ اثر (Effect) کا نام دیتا ہے اور روایات انتقادیہ "فن شعر" کا یہ زبردست احسان ہے۔ ہوریس نے "فن شعر" لکھ کر دراصل نظریۂ ارسطو کی اسپرٹ کو یورپ کے انتقاد کا مطمح نظر بنا دیا۔ اس لئے کہ جب ارسطو کی تصانیف فراموش ہو چکی تھیں تو یہی کتاب پڑھی جاتی تھی۔ بلکہ اُس عہد میں بھی جب ارسطو یورپ میں بے انتہا مقبول تھا، ارسطو کے مقابلہ میں ہوریس کی تصانیف زیادہ مقبول تھیں۔ ہوریس کی ذہانت سے لبریز ملفوظات، اُسکی حسین ترکیبیں اور دلآویز پیرایۂ بیان، ہوریس کی تعلیم کی نشر و اشاعت میں بہت مددگار ثابت ہوئے۔

ایک خاص موقع کے سوا، ہوریس نے "شعریاتِ ارسطو" پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔ کیونکہ ہوریس فی الواقع حد درجہ اعتدال پسند نقاد تھا۔ ہوریس کا عقیدہ ہے کہ شعرائے یونان کو سامنے رکھنا چاہئے اور شعر گوئی کی نوعیت وہی ہونا چاہئے جو یونان میں رائج و مسلم تھی۔ کیونکہ ہوریس کا خیال ہے کہ قدماء کا یہ احترام برقرار رکھنے سے جدت اور اُپج کے لئے بہت بڑی گنجائش نکل آتی ہے۔ مگر ہوریس سے یہ بات نظر انداز ہو جاتی ہے کہ یونانی ڈراما نویسوں نے اپنے کرداروں کے باب میں نفسیاتی اعتبار سے کتنی آزادی اور بیباکی برتی ہے۔ تاہم ایک بالکل مختلف موقعہ پر پوپ بھی قدماء کے اُسی احترام کا موید نظر آتا ہے جو ہوریس کی تعلیم تھی لیکن اُس کے احترام کے وجوہ بالکل دوسرے اور بدلے ہوئے ہیں۔ قدماء کا احترام کرنے کے لئے پوپ نے نہایت قابلِ قبول دلایل پیش کئے ہیں، مگر ہوریس کو مشورہ دیتے وقت اس کی ضرورت مطلق محسوس نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں تو ادب کا وجود ہی اسوقت ہو سکتا ہے جب وہ یونانی سانچے میں ڈھلا ہو۔

ہوریس اس خیال سے سخت متنفر تھا کہ شاعری کچھ دیوانگی سے ملتی جلتی چیز ہے؟ ہر چند کہ اس خیال کی ذمہ داری کہ شاعری اور دیوانگی میں ربط ہے، خود ارسطو پر ہے۔ چنانچہ ہوریس کو ایسے شعراء سے نفرت تھی، جن کے "الہامات" بہ لحاظِ صناعت دیوانہ وار صورتوں میں ظاہر ہوتے ہوں۔ ہوریس کی اعتدال پسندی کو شدید قسم کی اعتدال پسندی بنانے والی چیز انتہائی انفرادیت کا شوق و رجحان تھا۔

لیکن ایک خاص مسئلہ اور ہے جس میں ہوریس نہایت فراخ دل ہو جاتا ہے اور یہ عبارت و انشاء یا تعبیر (Diction) کا مسئلہ ہے۔ ارسطو نے جس طرح اس مسئلہ کو حل کیا تھا وہ مطلق اطمینان بخش

نہ تھا۔ ہوریس کا حل قطعیت کے ساتھ صحیح و درست ہے، مگر بدقسمتی سے تاریخ انتقاد میں یہی وہ مسئلہ تھا جس میں ہوریس کی فرزانگی بے اثر رہی، یعنی اُس کی کماحقہ قدر نہ ہوئی، لیکن اس عہد میں اُس کا وہ مسئلہ خاص نہایت قابل قدر ہوسکتا ہے۔

ہوریس کہتا ہے کہ شاعرانہ انشار کبھی قطعی اور حتمی نہیں ہوسکتی۔ شاعری کی زبان کو احساس کے ساتھ ساتھ بدلنا چاہیئے۔ زبان ایک درخت ہے اور الفاظ اُس کے پتوں کے مانند ہیں۔ امتداد وقت کے ساتھ پُرانے پتے جھڑتے جاتے ہیں اور اُن کی جگہ نئے نکلتے آتے ہیں مگر درخت اپنی جگہ قایم رہتا ہے۔

اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو تاریخ انتقاد میں ارسطو کے بعد ہوریس ہی کا نام سامنے آتا ہے اس قسم کا ادبی انتقاد جس کی بناء عقلی توجیہ پر ہو سب سے پہلے ارسطو نے دنیا کے سامنے پیش کیا، لیکن یہ امتیاز وخصوصیت ہوریس کی "فن شعر" کو حاصل ہے کہ اُس نے "شعریاتِ ارسطو" کی تعلیم کو ادبیات مغرب میں عام رواج دیا۔

ہوریس کے بعد بڑا نقادِ ادب ڈانٹے ہے۔ ڈانٹے نے ارسطو کو "اُستاد العلما" کا خطاب دیا ہے لیکن اُس ارسطو کو نہیں جس نے "شعریات" لکھی، "شعریات" کے مصنف ارسطو کو ڈانٹے نے کبھی نہیں جانا، البتہ وہ ہوریس کو جانتا تھا۔ ڈانٹے نے نقد ادب کی بحث میں جو اضافہ کیا اُس کا خاص مقصد ادبیات میں ایک قومی و ملکی زبان کی حمایت تھی۔ ڈانٹے نے غنائی اصناف کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ تاریخ ادب کے لئے بڑی قدر و قیمت کی چیز ہے، لیکن اُس کی یہ کوشش کہ وہ الفاظ کی جمالیاتی تقسیم کی بناء پر ایک اعلیٰ قسم کی ملکی انشار قایم کرے، بیکار بات ہے۔ جس نے اطالوی زبان کو ہومر اور ورجل کی زبان کا ہمپایہ بنا دیا وہ شاعر ڈانٹے تھا، فلسفی ڈانٹے نہ تھا۔ سب سے زیادہ اہم اور بہت زیادہ دلچسپ وہ دعوے ہے جو اس نے شاعری کے مرموز مفاہیم کے متعلق مبسوط طور پر پیش کیا ہے۔ اُس کے اس بیان کو نظریۂ ارسطو کا ایک بیش بہا ضمیمہ سمجھنا چاہیئے۔

اس میں شک نہیں کہ شاعرانہ الہام کی حیثیت سے انسانی واقعات کی مرموزی نوعیت (Symbolism of Nature) غنائی شاعری میں زیادہ نمایاں ہوتی ہے اور وہ جذباتی لمحہ جس کی یادگار غنائی شعر ہوتا ہے شاعر کی نظر میں بہت زیادہ مفہوم رکھتا ہے اور اگر زبان اُس پر پوری طرح متصرف ہوسکے تو بڑی کامیابی کی بات ہے۔

انتقادِ ادب کے باب میں یورپ کے عہد نہضت میں جتنا کچھ کہا گیا، اُس کا تعلق براہ راست ارسطو کی "شعریات" سے تھا اور تاریخ انتقاد کے باب میں عہد نہضت نے جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہ تھا کہ

عصرِ جدید کے لئے ارسطو کے فلسفۂ جمالیات کو زندہ کر دیا۔

فلاطون نے کہا تھا کہ شاعری فطرت کی نقل کرتی ہے، ارسطو نے جواب دیا کہ نہیں وہ فطرت کی تخئیل کی نقل کرتی ہے۔ ہر چند ارسطو نے اپنے نظرئے کو اسی نقطے پر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن عہد نہضت کے نقادوں نے اُسے واضح کیا۔ چنانچہ سر فلپ سڈنی اپنی کتاب "اعتذار" (Apology) میں آزاد شاعری کی حمایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ شاعری کا صحیح مقصد فطرت کا ایسا متنی پیدا کرنا ہے جس کے اندر انبساط پہونچانے والا عنصر بدرجۂ کمال پایا جائے۔ بیکن اسی کو زیادہ گہرائی کے ساتھ لکھتا ہے کہ شاعری ہمارے نفس کی آرزو کے مطابق اشیاء کی نمایش کر کے نفس میں علو و راستی پیدا کرتی ہے۔

جس کو ارسطو کے فلسفۂ جمالیات کا نظریہ کہا جاتا ہے، عہد نہضت میں اس کو بیکن نے "نفس کی آرزو" کا نام دیا اور کینٹ نے "مقصد اشیاء کو دوسروں تک پہونچانے کی آرزو" کہا۔ شیلے بھی یہی کہتا ہے کہ شاعری اخلاقیات کا درس دئے بغیر ایک اخلاقی اثر رکھتی ہے، کیونکہ اخلاق عبارت ہے عالی و پاکیزہ حیات ذہنی سے جس کا تغذیہ شاعری سے ہوتا ہے۔ شاعری کے اندر ہم ایسی دنیا میں جیتے ہیں جہاں ہمیں مقصدِ اشیاء اور اخلاقیات کا احساس حاصل ہوتا ہے۔ اب یہ سوال ہے کہ یہ فوری اطمینان پہونچانے والی دنیا احساس کے کس عالم میں واقع ہوئی ہے؟ (Benedetto Croce) کہتا ہے کہ ایسا عالم اُس احساس کے اندر ہے جو خود اپنی ذات کی بناء پر قبول کیا گیا، اُس عالم میں "حقیقتِ احساس" کا سوال پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ہم احساس من حیثِ احساس ہی سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ (Croce) اپنے جواب کو حواس اور جذبات کی وہبیت کا پابند کر دیتا ہے۔ لیکن کہا جا سکتا ہے کہ ہر چیز حتےٰ کہ بحث معقولات بھی وہبی ہو سکتی ہے اور اُسے خالص احساس کہا جا سکتا ہے۔ لہٰذا فطرت کا تصور جسے شاعری پیش کرتی ہے (اور شاعری عام طور پر ادب کی قایم مقام ہے) ایک ایسی دنیا کا تصور ہے جس کی ہمیں شدید آرزو ہوتی ہے اور جس کا وجود محض تخئیل کے اندر ہے۔ دنیا میں ہم جس چیز کی شدید آرزو کرتے ہیں وہی چیز قانون اور ضابطہ ہے اور ہر قسم کے ادب محض کا ابہام ایسی ہی دُنیا کا تصور پیش کرتا ہے، جس کا وجود اس لئے ہو کہ وہ ہمیں اپنے وجود کے متعلق کامل رشتۂ باہمی اور تطابق کا یقین دلا سکے۔ افسانہ یا ناول، ڈراما یا رزمیہ یا نغماتی شاعری عرض جس طریق پر بھی الہام تخئیل کو پیش کیا جائے گا، یہ بات درست و صحیح ہوگی۔

انتقادیات کے اندر اس رجحان کو نظریاتی کہا جا سکتا ہے! لیکن نہضت یورپ کے وقت سے ایک دوسرا رجحان بھی پایا جاتا ہے جو کم از کم اتنا ہی اہم ہے، یعنی ادبی طرز کی تنقید کا رجحان۔ طرز ادب کے نقد کا سرچشمہ بھی ایک یونانی مقالہ ہے جو بالعموم (Longinus of the sublime) کے نام سے معروف ہے

اور ایک ایسی تصنیف ہے جو اہمیت کے اعتبار سے بعض وقت "شعریات" کی حریف معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقتاً وہ تمامتر تنقیدی تصنیف ہے اگرچہ وہ پہلی صدی عیسوی کی ایک یونانی تصنیف ہے لیکن تاریخ انتقاد میں اُس کی اہمیت بالکل جدید چیز ہے۔ ۱۵۵۴ء میں جب وہ پہلی بار شایع ہوئی تو دنیا کو اسکی اہمیت کا علم ہوا۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ زمانۂ قدیم یا متوسط کی تہذیب اس تصنیف کے وجود سے بالکل ناآشنا تھی۔ اُس کے گمنام مصنف کی کوشش یہ تھی کہ طرز ادب کی وجہ سے زبان جو علو حاصل کر لیتی ہے، اُس کو جتمی بنایا جا سکے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مصنف ادب کا پہلا تقابلی نقاد تھا۔ وہ یونانی و لاطینی کے علاوہ عبرانی ادب کی مثالیں بھی لاتا تھا سہولت کے خیال سے ہم اُسے لانگنیس ہی کہیں گے۔ چنانچہ لانگنیس کے خیال کے مطابق "طرز" کے اندر ایک تصنیف کی اسپرٹ اور مصنف کی انفرادیت کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس قول کی ابتدا از کہ "طرز ہی آدمی ہے" لانگنیس سے ہوئی ہے۔ لیکن صرف اتنا کہکر چھوڑ دینے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لانگنیس ایک سطحی نقاد تھا۔ "طرز ہی آدمی" ضرور ہے، لیکن وہ آدمی ہے جو ایک خاص کام کسی خاص حالت میں کر رہا ہے۔ اُس نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ تصنیف و مصنف، دونوں کی فطرت کے اُن مختلف اسباب کی تقسیم کرے جو "اعلےٰ" طرز پیدا کر سکتے ہیں۔ اُس کی یہ اسکیم بالکل اطمینان بخش تو نہیں لیکن کار آمد ضرور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ طرز کی بلندی کا ذریعہ تخیل کی شوکت، جذبے کا جوش اور طرز ادا ہے اور انھیں چیزوں سے عمدہ طرز کے لئے ایسے مستند قاعدے نکل سکتے ہیں جن کی خلاف ورزی قطعی معیوب سمجھی جائے۔ وہ اگرچہ معترف ہے کہ مطانت کسی قاعدے کی پابند نہیں، لیکن اُس کا یہ اعتراف اُس کے قاعدوں سے متخالف نہیں، کیونکہ قصور بہرحال قصور ہے خواہ وہ کسی فطین ہی سے سرزد کیوں نہ ہوا ہو۔ لیکن ایک فطین کی سرگرم قوت و توانائی جو قواعد کو نظر انداز کر دیتی اور غلطیوں کی مرتکب ہوتی ہے، مجموعی نتیجے کے اعتبار سے اُس محتاط شخص کے مقابلہ میں جو ہر وقت قاعدوں کو دوہراتا ہو اور ہر قسم کے خوف و خطر سے بچتا ہو، بہت زیادہ قابل قدر کام کر سکتی ہے۔ بایں ہمہ ہر شاعر جو اپنے جوہر سے بہتر کام لینا چاہتا ہے قواعد سے متعلق نہیں ہو سکتا، کم از کم اُس "صناعت" کو نظر انداز نہیں کر سکتا جسے وہ اپنی تحقیقی طاقت کی "صناعت" کہتا ہے۔ مگر کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ شاعری ایک وہبی ملکہ ہے، لیکن شاعر کی فرزانگی اس میں ہے کہ وہ اپنے انعام قدرت کے بہترین استعمال کا سبق صناعت سے حاصل کرے۔ اس تنقید کی رو سے جسے ہم لانگنیس کے وسیع مفہوم میں "طرزی" کہہ سکتے ہیں، شاعری کا یہ انداز انگریزی ادب میں سب سے پہلے بن جونسن (Ben Jonson) کے کلام میں رونما ہوا۔ لیکن انگریزی ادب میں "نقد طرز" کو جس نے پوری طرح پیش کیا وہ پوپ تھا۔ تنقید پر اُس کا مضمون نظم میں ہے اور اُصولاً ایک نظم ہی کی طرح اسے دیکھا جانا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ پوپ کی ذہانت و ہنرمندی کی ایسی

نمایش کسی دوسری نظم میں نہیں پائی جاتی۔ اُس نظم کا موضوع نقد ادب ہے اور تاریخ انتقاد کی بحث میں نہایت اہم درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ اُس کے اندر ارسطو، لانگینس اور بین جونسن اسکول کے اثرات، ڈرائڈن کی فہم عامہ ادب کے فرانسوی مطامح اور فلسفہ ڈیکارٹ کی عقلیت کو ایک جگہ کر دیا گیا ہے۔

فطرت حقیقتاً عقل کی مترادف ہے اور فطرت خود اتنی زیادہ فطری نہیں جتنی وہ صناعت کے اندر ہوتی ہے (بشرطیکہ وہ صناعت قدیم قواعد کے مطابق ہو) پوپ کے نظریے کا بنیادی پتھر ہے۔ پوپ نے ہوریس کی طرح قدماء کا احترام محض اس بناء پر روا نہیں رکھا کہ وہ اسلاف تھے بلکہ وہ اُن کا احترام اس لئے کرتا تھا کہ انھوں نے کسی نہ کسی طرح راز فطرت کو پالیا تھا۔ مگر پوپ کا نظریہ اس سے آگے نہیں بڑھتا کہ شاعری جس فطرت کی نقاشی کرتی ہے وہ ایسی فطرت ہے جسے ہم "جاننا چاہتے" ہیں۔ چنانچہ پوپ سے ہمیں کوئی خاص چیز ایسی نہیں ملتی جو ارسطو سے ملی ہو۔ لیکن پوپ ایک خاص قسم کی شاعرانہ انشاء و عبارت (اور وہ بھی صرف لسانی نہیں بلکہ تصوری و تخیلی بھی) کا موید ہے اور یہ وہ چیز ہے جسے ہم عام طور پر اٹھارویں صدی کے طرز شاعری سے موسوم کرتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کی طرز شاعری بہ اعتبار انشاء و عبارت بہت نمایاں ہے لیکن اس میں کبھی کبھی فنی اُصول سے انحراف کو جائز رکھا گیا۔ اور ورڈزورتھ کے بعد روایات نقد میں تسلیم کر لیا گیا کہ ادب میں ہر قسم کی زبان و انشاء جو مصنف کی غرض پوری کرتی ہو جائز ہے اور اس طرح اس نے آیندہ ادب کے لئے آزاد طرز کی راہ کھولدی۔ لیکن اس کے باوجود اٹھارھویں صدی کا سبق ذہنوں سے بالکل محو نہیں ہوا۔ روایاتِ نقد ادب پر لانگینس اور بین جونسن کے نقوش آج بھی پائے جاتے ہیں۔

تنقید کے سلسلہ میں ایک اور تیسرا رجحان بھی پایا جاتا ہے جسے رومانی رجحان کہنا چاہئے۔ یہ رجحان صرف ادب اور نقدِ ادب کے اندر محدود نہیں بلکہ اس کا حلقۂ اثر بہت وسیع ہے۔ اس رجحان نے ادب میں ایک اور نئے معیار کو پیدا کیا جسے جلالت (Sublimity) کہتے ہیں:

تنقیدی روایات کے اندر یہ چیز قطعی طور سے برک کے وقت سے شروع ہوتی ہے جس نے ادب میں جلالت کے ساتھ حُسن پر بھی بحث کی ہے۔ برک کہتا ہے کہ کیا شاعری کے اندر "حسن ہی خاص چیز ہے؟ اور کیا "جذبہ" اس سے زیادہ اہم نہیں ہے؟ برک کے خیال میں ادبی حُسن مشتمل ہے نزاکت، صفائی، رعنائی اور ایجاز پر لیکن ایک جذبے کے اظہار کی مشق و فراوانی بجائے خود آفریں ہے اور جذبہ جتنا گہرا ہوگا انبساط بھی اتنا ہی زیادہ گہرا ہوگا۔ اور جو شے ہمیں جذباتی اثر سے متاثر کر دیتی ہے اسی کا نام جلالت ہے۔

کینٹ نے اپنی ایک تصنیف میں برک سے اتفاق کیا ہے کہ جمالیاتی فیصلے کے اندر "جلال" و "جمال" دو صاف واضح قسمیں ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ اُس کا یہ بھی خیال ہے کہ "جلال" سے حصول انبساط ہونا

اس پر مشتمل ہے کہ نفس سے عظمت فطرت کا سراسیمہ یا بدحواس کر دینے والی قوت کا اثر زایل ہو جائے۔ یعنے انسان، فطرت کے مقابلہ میں اپنی اخلاقی برتری کے احساس سے تقویت حاصل کر سکے۔ کینٹ قدرتی مناظر میں جمالیاتی فیصلے کا زیادہ امکان مانتا تھا اور صناعت کے اندر کم۔ لیکن مناظر قدرت کے "جمال" سے متعلق کینٹ کا استدلال اور صناعت کے اندر "جلال" سے متعلق برک کی بحث، ان دونوں کو اگر شامل کر لیا جائے تو جمالیاتی احساس کی رسائی و اثر کو بہت بڑھایا جا سکتا ہے۔

لیسنگ نے اپنے مشہور مقالے میں ادب اور صناعت مصورہ (Graphic Art) سے بحث کی ہے۔ اُس کی تنقید کا طریقہ وہی ہے جو برک اور کینٹ کا ہے وہ لکھتا ہے کہ "جمال" تصوری صناعتوں کا نصب العین صرف "اظہاریت" ہے وہ "جمال" جو مرئی اشکال کی خوش وضعی (Shapliness) سے ظاہر ہوتا ہے، "اظہاریت" سے تباہ ہو جاتا ہے۔

شاعری اور تصویری صناعتوں کے اثر کا فرق اُس فرق کی وجہ سے ہے جو ان دونوں کے موضوع میں پایا جاتا ہے۔ لیسنگ نے ایک قدیم یونانی قول نقل کیا ہے کہ "نقاشی" خاموش شاعری ہے اور شاعری ناطق نقاشی" اس قول سے ان دونوں کی مماثلت پر روشنی پڑتی ہے، لیکن اُن کا فرق و اختلاف بھی کم اہم نہیں۔ نقاشی سے اُس کام کی کوشش ہرگز نہ کرنا چاہئے جسے صرف ادب انجام دے سکتا ہے اور ادب کو ایسے کام کی سعی نہ کرنا چاہئے جو صرف نقاشی کر سکتی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شاید لیسنگ کی نظر اُس فرق و امتیاز کی گہرائی پر نہیں پڑی جو خود اُسے تسلیم تھا اور زمانہ مابعد کا انتقاد بھی بعض اوقات اس فرق کو نہیں دیکھ سکا ہے۔ کیونکہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ایک تصویر "کہانی کہتی ہے" تو کیا اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ وہ واقعتاً ادب کا مقابلہ کر رہی ہے؟ ادب اپنے موضوع کو حقیقی شکل و صورت میں یا رنگوں کے ذریعہ سے کیونکر پیش کر سکتا ہے؟ اور اس طرح شعری بیان مملکت نقاشی کی حدود میں کس طرح داخل ہو سکتا ہے؟ چنانچہ لیسنگ نے فنون یا صناعتوں کی حد بندی پر زور دیکر فن انتقاد کی زبردست خدمت انجام دی ہے۔

روایات انتقاد میں "رومانیت" نے جو بڑا اضافہ کیا وہ یہ ہے کہ اُس نے توجیہ و تاویل کی آزادی بھی دیدی اس کے ثبوت میں لیمب، کالرج اور ہیزلیٹ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایک بات ضرور ہے کہ رومانیت غیر ذمہ دارانہ اسپرٹ کی بھی ہمت افزائی کرتی ہے اور اس خطرے کا تدارک منیزونی (Menzoni) نے اپنی بلند پایہ نظم (Il conte di carmagrola) کے دیباچہ میں کیا ہے۔

ل۔ احمد اکبر آبادی

اندھی

(مسلسل)

ایکٹ چہارم — سین اول

(سرن کا کمرہ۔ سرن ایک چارپائی پر پڑا ہوا ہے اس کے سر اور جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ وہ کبھی آنکھیں کھول لیتا ہے اور کبھی بند کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر سرن کے پاس کھڑا ہوا بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔ نیلم بھی متفکرانہ انداز سے سرن کی طرف دیکھ رہا ہے)

نیلم :۔ ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر :۔ کچھ فکر کی بات نہیں!

دوسرا :۔ اگر تیس منٹ اور اسی طرح گزر جائیں تو خطرہ نہ رہے گا۔ سرن بابو کو اسوقت اپنے دماغ پر ذرا بھی زور نہ دینا چاہئے۔

نیلم :۔ ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر :۔ سرن بابو کے کان میں تمھاری آواز نہ جانی چاہئے ورنہ وہ تمھاری آواز سنکر تم سے ضرور بولنے لگیں گے اور اسوقت ان کو ذرا بھی بولنا نہ چاہئے!

(دروازہ پر دستک کی آواز آتی ہے)

ڈاکٹر :۔ کمرہ میں کسی کو نہ آنا چاہئے!

نیلم :۔ کون ہے!

(نیلم جاتا ہے اور چند آدمی نظر آتے ہیں)

ایک :۔ کہو!

نیلم :۔ کیا کہوں، دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اگر تیس منٹ ایسے ہی گزر جاویں تو شاید امید بندھے۔

پہلا :۔ مگر شری ایسی چوٹ دے گئی ہے!

دوسرا :۔ سرن کی شکل تو دیکھو!

تیسرا :۔ معلوم ہوتا ہے خیالات اب بھی پریشاں کئے ہوئے ہیں۔

(نیلم اندر داخل ہوتا ہے)

ایک :۔ کون تھا۔

نیلم :۔ ایک پبلشر تھا

"کیوں آیا ہے"

نیلم :۔ کچھ روپیہ ادا کرنے آیا ہے

"روپئے؟"

(سرن حرکت کرتا ہے)

سرن سے نہ ملایا۔ تم لے لو روپیہ بعد میں انکو دیدینا

سرن :۔ نہیں! روپیہ اب مت لینا۔ اب کیا کرونگا روپیہ کا — میں تو

"آپ بات نہ کیجئے، بولنا مہلک ہے"

سرن :۔ مت لینا روپیہ۔ کیا ہوگا۔ میں تو یہاں سے جا ہی رہا ہوں اور شری کو اب روپیہ کی ضرورت نہیں۔ اسے کسی کے روپیہ کی ضرورت نہیں اس کی زمینداری ہے۔ اس کے پاس دولت ہے۔ اس لئے اسے اب میری دولت کی کیا ضرورت!

نیلم :۔ بھائی صاحب! بمشکل تمام تو آپ کو ہوش آیا ہے۔ پھر آپ اس قدر بولنے لگے!

سرن :۔ چپ رہا ہی نہیں جاتا۔ تم میرے پاس ہو تو جی چاہتا ہے اپنے دل کا حال تم سے کہوں۔ یہاں اور کون ہے جس سے کہوں تم سے دل ملتا ہوں۔ شری تو چلی ہی گئی!

نیلم :۔ جانے دیجئے، خواہ مخواہ آپ ان کو یاد کر کے اپنی پریشانی بڑھا رہے ہیں!

سرن :۔ اس کا خیال کیسے نہ آئے بھائی۔

نیلم :۔ جب آپ اچھے ہو جائیں تو مجھ سے جی بھر کر باتیں کر لیجئے گا۔

سرن :۔ مجھے شک ہے میں اچھا نہ ہو سکوں گا اور پھر مجھے تم سے جی بھر کر باتیں کرنے کا موقع ہی نہ ملے گا

نیلم :۔ اچھا کسی اور وقت آپ سے بات کروں گا

سرن :۔ جاتے کہاں ہو!

نیلم :۔ باہر۔

سرن :۔ روپیہ نہ لینا۔ کیا ہوگا اب۔ میں جا ہی رہا ہوں شری چلی ہی گئی ہے۔ اس کو کسی کے دولت کی ضرورت نہیں۔ اس کو تو میری بھی ضرورت نہیں! مگر نہیں ٹھیرو۔ روپیہ لیلو — آہ — شاید بعد میں شری کے کام آوے! دولت گھٹا کی طرح آتی جاتی رہتی ہے!۔ شاید اس کے کام آجائے۔

نیلم :۔ خدا کے لئے شری کا ذکر نہ کیجئے۔

سرن :۔ مگر آج تو شری کی یاد اور زیادہ آرہی ہے۔ شری! اب آخری وقت ہے نیلم! جب کوئی دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو دنیا کی تمام چیزوں کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

نیلم :۔ تو کیا ہوا۔

سرن :۔ تو پھر شری کی یاد کیوں نہ ستائے۔ اسکو تو میں ہمیشہ سے پیار کرتا آیا ہوں۔ اس کو میں کس طرح سے بھول جاؤں! اگر وہ تو میرے پاس سے چلی گئی ہے، اب کیا آسکتی۔

نیلم :۔ ان کو بلانے بھیجا ہے۔

سرن :۔ ان کو بلانے بھیجا ہے!۔ کیوں؟ کیا ان کو بھی میرے حال کی خبر کر دی۔

نیلم :۔ ہاں! — ہرج کیا ہے!

سرن :۔ مرنے کے بعد اگر خبر ہوتی تو اچھا ہوتا! ہاں اور کیا شاید میں شری کو نہ دیکھ سکوں گا!

نیلم :۔ آپ دیکھ سکیں گے آپ تو اچھے ہو رہے ہیں!

ڈاکٹر :۔ یہ کیا ہو رہا ہے، ان کو خاموش رہنا چاہیئے، بالکل خاموش، ورنہ سارے ٹانکے ٹوٹ جاوینگے،

سرن :۔ اگر شری میرے بعد۔

نیلم :۔ چپ رہیئے بھائی۔

سرن :۔ کیسے چپ رہوں۔ مرنے والے انسان کو اپنی خواہش تو ظاہر کر لینے دو۔

نیلم :۔ آپ چپ رہیئے۔ آپ تو اچھے ہو رہے ہیں۔

سرن :۔ اگر شری۔

نیلم :۔ پھر شری! آپ شری سے ملنا چاہتے ہیں؟

سرن :۔ کہاں ہے وہ؟

نیلم :۔ آپ خاموش رہیئے۔

سرن :۔ اگر شری میرے بعد میں آوے تو اسکو یہ روپیہ اور جو کل کا چیک ہے دیدینا۔ شاید خوش ہو کر وہ مجھ سے اُس جنم میں ملنے کی خواہش کر سکے میرے بغیر کیا وہ رہ سکے گی۔ (دروازہ پر دستک کی آواز) کیا وہ اکیلی رہ سکے گی؟

(نیلم جاتا ہے)

باہر سے آواز :۔ شری بی بی آگئیں!

سرن :۔ شری! شری آگئی۔ شری آگئی! شری۔

(سب ایک دوسرے کی منھ کی طرف تکتے ہیں)

سرن :۔ شری کو آنے دو! شری!

(دروازہ کھلتا ہے۔ نیلم داخل ہوتا ہے اور اسکے پیچھے شری۔ اس کا چہرہ پژمردہ ہے)

ڈاکٹر :۔ (نیلم سے شری کی طرف اشارہ کرتا ہوا) ان کو ابھی سرن بابو کے پاس نہ آنے دیجئے۔

سرن :۔ وہ اکیلی نہیں رہ سکتی۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی!

(شری آگے بڑھتی ہے مگر نیلم اس کو روک لیتا ہے)

سرن :۔ کہاں رک گئی۔ شری کو آنے دو!

نیلم :۔ شری کہاں ہے؟ شری آتی ہوں گی۔ آپ خاموش لیٹے رہیں۔

سرن :۔ شری تو آگئی؟ میرے کان دھوکا نہیں دے سکتے میں نے صاف سنا کہ شری آگئی!

(اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے ڈاکٹر اور نیلم اس کو پکڑ لیتے ہیں)

نیلم :۔ کس کے پاس جاتے ہو۔ کوئی ہو بھی؟

سرن :۔ مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو۔ مگر میرا دل کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ اُٹھنے دو مجھے! وہ ہے۔

(سرن اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے)

نیلم :۔ ہاں ہے مگر وہ ابھی نہیں آسکتیں!

سرن :۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی!

نیلم :۔ ہاں ہاں۔ مگر تم نہ اُٹھو۔ ان کو تمہارے پاس ابھی نہ آنا چاہیئے۔

سرن :۔ مجھے اس کے پاس جانے دو۔ شاید آخری وقت ہی مجھ سے خوش ہو سکے!

(شری گہری سانس لیتی ہے)

نیلم :۔ وہ یہیں آتی ہیں!

سرن :۔ وہ یہاں کیسے آئے گی!

نیلم :۔ کیوں۔

سرن :۔ اس کو میری ضرورت نہیں!

(شری سر دیوار سے ٹکراتی ہے)

سرن :۔ یہ تو شری کی آواز ہے۔ میرے کان کبھی دھوکا نہیں دے سکتے۔۔

شری :۔ ہاں۔ تمہارا دل۔ تمہارے کان کبھی تمہیں دھوکا نہیں دیتے۔ میرے کانوں نے میرے دل نے مجھے دھوکا دیا!

سرن :۔ شری۔

(شری چارپائی پر بیٹھ جاتی ہے)

سرن :۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم اب کبھی نہ آؤ گی۔

(کنتی بھی آجاتی ہے)

کنتی :۔ سرن بابو یہ آپ نے کیا کیا۔

سرن :۔ کیا کرتا۔ جب دنیا اُجڑتی ہوئی دیکھی تو خیال ہوا کہ اس کو پھر بسانے کی کوشش کروں۔ مگر مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ شری کو میری ضرورت نہیں تھی۔

کنتی :۔ آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ اگر پیر پھسل جاوے گا تو کیا حال ہوگا۔

سرن :۔ کنتی، میں کس کے لئے جینے کی فکر کرتا۔ کس کے لئے زندہ رہنے کی تمنا ہوتی۔ میں اسوقت زندگی سے بالکل بے پرواہ تھا۔

(کنتی شری کی طرف دیکھتی ہے۔ شری دوسری طرف دیکھ رہی ہے)

سرن :۔ میں سمجھے ہوئے تھا کہ شری اپنے بس میں نہیں ہے اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ اسکی آنکھوں پر سے پٹی کھولنے کے لئے ریل پر سوار ہوا تھا۔۔۔۔۔ آخری وقت دیکھنے کے لئے تڑپ رہا تھا

(شری بت کی طرح بیٹھی ہوئی دوسری طرف دیکھ رہی ہے۔ ماتھے پر شکنیں ہیں، کوئی مصمم ارادہ چہرہ سے ظاہر ہوتا ہے اور فوراً اُٹھ کر چلی جاتی ہے)

ایکٹ چہارم - سین دوئم

(شری تیزی سے اپنے کمرہ میں داخل ہوتی ہے جیسے کہ ایک جہاز زمین میں دھنسنے کو جا رہا ہو وہ چاروں طرف چرائی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہے وہی چراغ اب بھی طاق میں رکھا ہوا ہے۔ وہ پلنگ پر جا کر بیٹھ جاتی ہے، کمرے کے باہر آواز آتی ہے۔ "شری آگئی؟" شری حیرانی سے دروازہ کی طرف دیکھتی ہے۔ اور کواڑ بند کر دیتی ہے)

عورت کی آواز :۔ کب آئی،

کنتی کی آواز :۔ تھوڑی دیر ہوئی۔

(شری کان لگا کر سنتی ہے)

عورت :۔ شری اندھی تھی، اندھی۔

(شری اپنے کان دروازہ سے ہٹا لیتی ہے اور پھر تھوڑی خموشی کے بعد خود ہی بولتی ہے۔ بیشک میں اندھی تھی)

(کنتی باہر سے شری کے کمرہ کے دروازہ کو دونوں ہاتھوں سے پیٹتی ہے)

"شری شری!!"

شری اندر ایک جگہ کھڑی ہوئی ہے

"شری شری!!" کنتی نے کواڑوں کو اور زور

سے پیٹا، چٹخنی کھل گئی اور کواڑ ایکدم کھل گئے۔
کنتی چلاتی ہوئی آئی۔
"شری شری ۔ سرن گئے !!"
شری کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔
شری کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
"شری شری"۔ کنتی نے جھنجوڑا۔
شری ویسے ہی بت کی مانند کھڑی رہی گویا کہ کوئی مصمم ارادہ ابن نے بھی کر لیا ہے۔

(آخری سین)

(سرن کا کتب خانہ۔ شری کمرہ میں چاروں طرف بیقرارانہ ٹہل رہی ہے)

شری :- (آپ ہی آپ) میں نے سمجھا تھا تم یہاں ہوگے۔ مگر — مگر — تم تو آرام کی نیند سو گئے ہو"۔
(دروازہ پر کھٹکھٹانے کی آواز) شری! شری!!
آواز :- کواڑ کھولو۔
شری :- اپنا منہ دکھانے کو — آئیں!
(دروازہ پٹنے کی آواز)
(اسٹیشن کا سین شری کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے)
سرن :- شری - شری!! — لو!
(شری سرن کو کراہت سے دیکھتی ہے)
سرن :- یہ لو۔ جس کو تم چاہ رہی تھیں وہ یہ لو (شری کی طرف چیک بڑھاتا ہوا) اب تو شاید تم سمجھو گی کہ میں تم سے پریم کرتا ہوں۔ اگر دولت ہی پریم کی کسوٹی ہو؟
(شری کھڑکی میں سے چیک پھینک دیتی ہے اور دوسری طرف دیکھنے لگتی ہے۔ گاڑی چلنے لگتی ہے)
سرن :- شری؟ شری؟ تم غلطی پر ہو۔ تم بھول کر رہی ہو!
(شری کے سامنے سے وہ سین غائب ہو جاتا ہے)
شری :- (آپ ہی آپ) اسوقت تو مجھے سب کچھ سوجھ رہا تھا۔ اس وقت میں اپنی بھول محسوس کر رہی تھی مگر!!
(شری سرن کو چلتی گاڑی پر چڑھتا دیکھتی ہے۔ دوسرے لوگ اسے روکتے ہیں مگر سرن نہیں جاتا۔ شری کھڑکی سے سر نکال کر دیکھتی ہے! - اس کی گردن کھڑکی میں سے پوری نکل آتی ہے اور سرن کو گرتا دیکھتی ہے)
شری :- کھڑکی سے میں کیوں نہ کود پڑی - اندھی!
(وہی سین اس کی آنکھوں کے سامنے ہے)
کود پڑو کھڑکی سے کود پڑو۔ میں تمہارے پاس آتی ہوں
(دروازہ پیٹنے کی زور سے آواز) میں تمہارے پاس آتی ہوں
شری بے خودی کی حالت میں کھڑکی میں سے کود پڑتی ہے
دروازہ ٹوٹ جاتا ہے کنتی شوِرانی وغیرہ کمرہ کے اندر گھس آتی ہیں۔
شوِ ند:- شری - شری!
کنتی :- کہاں گئیں!
(کنتی کھڑکی میں سے جھانکتی ہے اور دیکھتے ہی ایک چیخ مارتی ہے)
کنتی :- دیکھو یہاں!
شمبھو :- کیا ہے؟
(سب کھڑکی میں سے دیکھتے ہیں کہ شری زمین پر مردہ پڑی ہوئی ہے)

شنکر سروپ بھٹناگر

ساٹھ سال کے بعد ہماری ادبیات

(۲)

ہندوستانی ادب کے وہ بڑے بڑے علمبردار جو خود انگریزی مطالعہ کے عادی تھے، ان چند ادیبوں کی کوشش سے اتفاق تو کرتے رہے جو دوسری زبانوں سے ترجمہ کرتے تھے یا طبع زاد کتابوں کی تصنیف یا رسالہ جات جاری کرنے میں مشغول تھے، لیکن خود ان کے بچوں کی تعلیم کا انحصار انگریزی ادب پر تھا وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی زبانوں کی کتابیں ان کے اُن بدقسمت ہموطنوں کے لئے تھیں جو اصل انگریزی تصنیفات سے فایدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہمارے ملک کے دو لاکھ گریجویٹ پنچانوے فیصدی غیر خواندہ زندگی بسر کرتے ہیں اور باقی میں سے بھی صرف ایک فی ہزار کوئی ایسا ہوگا جو سنجیدہ مطالعہ کا عادی ہو۔ ناردے ایسے چھوٹے و دور اُفتادہ ملک کی ذہنی ترقی اور اس کا معیار دیکھکر میں بڑی ذلت محسوس کرتا ہوں کہ ہم نے ۳۵ کرور آبادی رکھنے والے ملک میں کتنے ٹیگور و اقبال، آر ہندو گھوش و جے سی بوس پیدا کئے، لیکن اس کے باوجود یہ حماقت اب بھی جاری ہے کہ انگریزی زبان و ادب نے ہم کو یہ چیز سکھائی وہ چیز سکھائی حالانکہ سیکھنے والوں کی تعداد بھی معلوم ہے اور جو سیکھا ہے اس کی حقیقت بھی پوشیدہ نہیں۔ تقریباً بیس برس سے ہم کو تعلیمی خود مختاری حاصل ہے اور تقریباً پچاس کرور روپیہ اعلیٰ تعلیم پر صرف ہو چکا ہے۔ لیکن اس رقم کا کوئی قلیل حصہ بھی مجالس ترجمہ و تصنیف کے قیام میں صرف نہیں ہوا۔

اس سے قبل میں ہندوستانی زبانوں میں بچوں کے ادب کی شدید ضرورت کے متعلق لکھ چکا ہوں کہ اسکے بغیر ہم ایک کلرکوں کی قوم بنے رہیں گے اور پڑھنے والوں کی قوم نہ بن سکیں گے اور جب تک کہ ہندوستانی زبانیں یونیورسٹیوں میں تعلیم و امتحان کا علمی پیشوں کا اور زندگی کے تمام شعبوں میں تحریر و گفتگو کا ذریعہ نہ بنجائیں اسوقت تک ہم قوم کی تمدنی اور ذہنی زندگی نہیں بنا سکتے۔ قوم کی ذہنی زندگی کے لئے عوام کا طوفانی اور تقویت پہونچانے والا اثر بڑی چیز ہوا کرتی ہے۔ ذہنی زندگی کا راز بھی عوام کی زندگی میں پنہاں ہے۔ ایمرسن کے ان الفاظ میں کہ "صاحب ذکاوت دُنیا کا سب سے زیادہ مقروض انسان ہوتا ہے"، غالباً اس سے زیادہ حقیقت تھی جتنا کہ وہ سمجھتا تھا۔ زبان اور ادب کے الہامی جذبات عوام کی نیم شعوری زندگی اور ان کے خیالات سے پیدا ہونا چاہئے۔

ہم اپنے ادب کی ترقی و وسعت کے مسئلہ کو اتفاقی و امکانی تصنیفات کے خطرناک بھروسے پر نہیں چھوڑ سکتے ادب صرف اسوقت ترقی کر سکتا ہے جبکہ اس کی حیثیت فنی بھی ہے اور تجارتی بھی بلکہ یہ دوسری حیثیت کہیں زیادہ اہم ہے۔ غیر تعلیم یافتہ اور غیر ذمہ دار ناشروں کی موجودگی میں ادبی تصنیفات اپنی پوری رفتار سے جاری نہیں رہ سکتیں اس کے علاوہ تجارت کے اندرونی اندیشوں کا مقابلہ کرنے سے پہلے اس کو بالذات محفوظ ہو جانا چاہیے کہ یہ سوالات کہ کتابیں کون نشر کرے گا اور کون خریدیگا ان کا جواب دینا اسقدر ضروری نہیں جتنا یہ کہ اسکے مصنف کون ہوں گے اور وہ کیسی چیزوں کے مصنف ہوں گے۔ اس کا جواب کہ کتابیں خریدیگا کون یہ ہے کہ وہ لوگ خریدینگے جن کو ہم نے ہندوستانی زبانوں کی اوزان کے ذریعہ سے دوسرے علوم کی تعلیم دی ہے اور جن کے اندر ہم نے مطالعہ کی عادت پیدا کر دی ہے۔ اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے علاوہ اگر ملک سروس کمیشن اور حکومت کے دوسرے بورڈ اور امتحانی کمیٹیاں بھی مادری زبان کو پراونشل سول سروس اور تمام ملازمتوں کے مضمون میں ذریعۂ امتحان بنا دیں تو فنی اور تجارتی دونوں حیثیتوں سے ہمارے ادبیات کو بڑا فایدہ پہونچ سکتا ہے لیکن ایک ایسا بڑا اور ٹھوس ادارہ جو ان تمام ادبی فرایض کا ذمہ دار ہو شخصی تصنیفات اور شخصی نشر سے کہیں زیادہ بلند تنظیم کا محتاج ہے۔ آج ہم کو قاعدہ و اصول سے مرتب کئے ہوئے عظیم قاموسوں کی کافی تعداد میں شدید ضرورت ہے۔ سائنس فلسفہ معاشیات اور ہزاروں طرح کے دوسرے مضامین پر مطلع کرنیوالی علمی کتابیں ہمکو درکار ہیں۔ ادب سائنس جغرافیہ صنعت اور فلسفہ سے متعلق بلند معیار ادبی رسالوں کا سوال بھی ہمارے سامنے ہے اور ان فرایض کی انجام دہی کے لیے ہر یونیورسٹی اور کالج سے ملحق ادبی مجلسوں اور اداروں کا قیام ضروری ہے۔ حیدرآباد میں آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کا اردو میں منتقل ہو جانا ہندوستانی ادبیات کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے اگرچہ آپکو اسکی اہمیت کا خیال نہ ہو۔ حکومت کا فرض صرف اقتصادیات تک محدود نہیں ہے بلکہ تقسیم کے ذرایع مہیا کرنا اسکے اہم ترین فرایض میں داخل ہے ہر چند گردشی کتب خانے اور دیہی ترقی کی دوسری اسکیمیں اچھی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ میونسپلیٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں ابتدائی اور مڈل اسکولوں ہائی اسکولوں صنعتی اور زراعتی اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ طالبعلموں کو استادوں اور عام پبلک کے استعمال کے لئے ہندوستانی کتابوں کے کتب خانے قایم کریں ہمارے اسکولوں اور بہت سے کالجوں کے کتب خانے اس لحاظ سے نہایت افسوسناک حالت میں ہیں۔ بخوبی غور و خوض کے بعد مرتب کی ہوئی اچھی اسکیم کے مطابق اس غرض کیلئے شاید ایک قومی ٹیکس کی بھی مخالفت نہ ہوگی اور ایک قانون بنا کر ناشروں کو ایسے کتب خانوں کے ہاتھ اپنی کتابیں نصف اور بعض اوقات ثلث قیمتوں پر بیچنے کے لئے مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اور بعض شعبوں میں قیمتوں کا حکومت کی جانب سے منضبط کرانا بھی ضروری ہوگا۔

ایک وقت آئے گا کہ ہندوستان کی خاص زبانیں تعلیم و امتحانات کا ذریعہ بن چکی ہوں گی۔ ان میں بلند پایہ ادبیات کا اضافہ ہوگا۔ ہندوستان کی تمدنی شیرازہ بندی اور پختگی شروع ہو چکی ہوگی۔ دارالمطالعے کتب خانے عجائب خانے اور دوسرے تعلیمی و تمدنی ادارے کتابوں سے بھرے ہوں گے۔

لیکن اگر غیر ممالک کی ادبیات سے مفید اور عمدہ کتابوں کے ترجمے بڑے پیمانے پر شروع کر دئے جائیں اور بغیر کسی روک ٹوک کے جاری رہیں تو بھی تقریباً پچاس برس میں یہ اسکیم درجۂ تکمیل کو پہونچے گی۔ سنہ ۱۹۶۰ء تک تو غالباً ہم اسکولوں میں انگریزی کو ایک علٰحدہ لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھانے پر مجبور رہیں گے اور ہندوستانی یونیورسٹیوں کے متعلمین کو اس کے بعد تیس برس تک اور انگریزی یا اس کے بجائے کوئی دوسری فرنگی زبان پڑھنی پڑے گی لیکن ثانوی تعلیم پانے والوں کی تعداد اب سے دگنی ہو جائے گی اور یونیورسٹی کے طلبا میں کم و بیش پچاس فیصدی کا اضافہ ہو جائے گا۔ انگریزی تعلیم کا صرف ایک معقول اور حیات بخش مقصد ہو سکتا ہے۔ یعنے ہندوستانی ادبیات کی تعمیر اور اسی لئے میں نے عرض کیا کہ ایک علٰحدہ لازمی مضمون کی حیثیت سے انگریزی کی تعلیم کو جاری رہنا چاہیئے۔ سنہ ۱۹۶۰ء تک انگریزی داں ہندوستانیوں کی تعداد برابر بڑھتی رہے گی۔ لیکن اس کے بعد نوراً ہی ایک زبردست کمی ہو گی کیونکہ ہائی اسکولوں میں انگریزی لازمی مضمون نہ رہے گی اور شاید کم و بیش دس بیس فیصدی لوگ اسے اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھیں۔ یہ دس فیصدی طلبہ یونیورسٹی جا کر سنہ ۱۹۹۰ء کے شروع تک انگریزی فرنچ۔ جرمن۔ روس۔ اطالین۔ یونانی یا کوئی دوسری غیر ملکی زبان پڑھتے رہیں گے۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ موجودہ صدی کے ختم ہوتے ہوتے جبکہ ہر ہندوستانی زبان ترجموں اور طبع زاد تصنیفوں کی وجہ سے کافی ترقی یافتہ ہو جائے گی تو ہم انگریزی زبان سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

ہندوستانی زندگی کے اس پس منظر اور اس بدلتی ہوئی تصویر کا اندازہ کر کے آیئے ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ موقت ملک کے میلانات و رجحانات کیا ہوں گے۔ اس کے لئے ہم کو ہندوستانی زبانوں اور ادب کے پیمایشی خط (Curve) پر نظر ڈالنی ہو گی۔ موجودہ زمانہ انقلاب کے امکانات سے بھرپور ہے ابھی کچھ سالوں تک ہم کو نہایت آزمایشی دور سے گزرنا ہو گا۔ اس لئے ادب کی تعمیر اور ساخت میں جس چیز پر خاص توجہ دینی چاہیئے وہ عوام کی بیداری ہے۔ ابتک ہندوستان کا ادبی نشاۃ الثانیہ متوسط طبقہ کے تمدن کا آئینہ دار رہا ہے اور اسی کے لطیف جذبات اور اسی کے سماجی حالات سے بھرا پڑا ہے۔ عوام کی زندگی بالکل نظر انداز کر دی گئی ہے۔ چنانچہ آپ کو تمام مشہور ہندوستانی مصنفوں کی تصنیفات میں شخصیت پسندی کی جھلک کسی نہ کسی شکل میں ضرور نظر آئے گی، لیکن اب حالت بدلتی جا رہی ہے اور امید ہے کہ کچھ زمانہ کے بعد ہماری شاعری۔ ہمارے افسانوں۔ ڈراموں اور مختلف اصناف ادب میں سیاسی و سماجی تصور روز بروز ابھرتا جائے گا۔ ناولوں اور دیگر تصنیفات کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہو گی کہ ان میں سماجی سیاسی اور تعلیمی تحریکات پر زور دیا جائے گا۔ تاریخ کے ارتقائی ڈرامہ کا منظر پیش کرنا یہی ہمارے ادبی حسن کاروں کا مقصد ہو گا۔ ہمارے ادب میں ایک اجتماعی مواد ہو گا۔ ماضی اور حال کی تصویر اور مستقبل کا تصور سماجی طاقتوں کے موافق

اور مخالف رجحانات کی روشنی میں پیش کیا جائے گا۔ سائنس اور اس کے امکانات نئی سماجی تنظیم و ترتیب۔ سرمایہ داری، قومیت اور شہنشاہیت کا زوال ساری دنیا میں ایک نئے نظام کا قیام یہی تمام صورتیں ہمارے ادبی حسن کاروں کے دماغ پر چھاتی رہیں گی اور ان کی تخلیقی کوششوں کا مرکز بن جائیں گی

اس مضمون کے شروع کی قسطوں میں میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ آیندہ چلکر ہندوستانی زبانوں پر عوام کی بول چال اور ان کے الفاظ کا ریلا سیلاب کے مانند چھا جائے گا، زبان تیز۔ کارگر اور سادے الفاظ کی آہنگ سے مالامال ہو جائے گی۔ ہر صنف ادب کا نہ صرف طرز بیان بلکہ موضوع، مواد اور غایت ہی بدل جائے گی۔ تعلیمی وسعت کے بعد ایک ہی نسل کے اندر اندر مزدور اور کسان طبقوں سے سیکڑوں مصنف پیدا ہوں گے۔ اسی کے ساتھ مزدور اور کسان قارئین کی تعداد کروروں تک پہونچ جائے گی۔ عامۃ الناس کی زندگی کے ہزاروں متنوع مناظر اور مختلف پیشوں۔ ریت رسموں اور دلچسپیوں کی جیتی جاگتی تصویریں کچھ اس طرح پیش کی جائیں گی کہ ادب کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ ہوئی تھیں۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ ہمارے ادب میں کردار۔ افراد اور اقسام کا کتنا تنوع پیدا ہو جائے گا۔ کس قدر مختلف طبقے اور پیشے۔ نفسیات کی کتنی نئی اور دلچسپ حقیقتیں۔ کتنے دیکھے اور ان دیکھے خواب۔ محسوس اور نامحسوس جذبے اور خواہشات حقیقی اور خیالی کارنامے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی پر لطف تصویر۔ سماجی اور گھریلو زندگی کا حسین ڈرامہ داخلی اور خارجی مسایل کا تنوع!۔ الغرض ہندوستانی ادب خود فراموشی کے طویل خواب سے بیدار ہو جائیگا لیکن جیسا کہ پہلے عرض کر دیا گیا اس ادب کا حسن اور خوبی صرف رنگینی اور مناظر کی بہتات پر مبنی نہ ہوگی۔ اس کی حدود صرف ایک لطیف جمالیاتی احساس اور تخلیقی داخلیت پر ختم نہ ہو جائے گی۔ ممکن ہے میرا یہ دعوے بظاہر بے حقیقت اور جرأت انگیز معلوم ہو لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ مستقبل میں ہمارے سب سے بڑے مصنفین بالعموم اشتراکی افراد موجودہ سماج سے باغی اشخاص ہوا کریں گے اور سماجی نظام اور اس کی سیکڑوں شکلیں ایک ایسا موضوع ہوں گی جن کی جھلک ہر وقت اور ہر چیز میں موجود ہوگی۔ جب کوئی مخصوص فرد یا کردار پیش کیا جائے گا۔ اس کی تصویر اسی سماجی نظام کے پس منظر میں پیش کی جائے گی اسی نظام کی تخلیق کردہ ہوگی۔ وہ مصنفین جو ذہنی حیثیت سے بلند ہوں گے وہ اس امر کی طرف اشارہ کریں گے کہ ان تمام چیزوں کا سماجی قوتوں سے کیا تعلق ہے۔ زندگی کے ماحول اور پس منظر کی حقیقت کیا ہے۔ ان کی تصنیفات ایسی نہ ہوں گی کہ جن میں اس تیزی اور ذہنی بلندی کے باوجود مقصد کا فقدان ہو اور جو ہم کو کسی خاموش یا ظاہر نتیجہ تک نہ پہونچاتی ہوں۔ نہ وہ جذباتی اخلاقیات تک محدود ہوں گی اور نہ وہ لاینحل مسئلوں کے جمالیاتی اور بے معنے حل پیش کریں گی۔

اب اس سلسلہ میں یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے کہ بین الصوبجاتی زبان کیا ہوگی؟۔ ہندوستان کے انتشاری رجحانات کے باوجود ہندوستان کے تمام دوسرے حصوں کی تاریخ اور ان کا تمدن قدیم زمانہ سے اُس حصہ سے متاثر ہوتا رہا ہے جو "دادی گنگ" کے نام سے موسوم ہے۔ اس حصّے کی "بنیادی" زبان ہردور میں بین الصوبجاتی پیغام در سایل کا ذریعہ رہی ہے۔ آج اپنی معیاری شکلوں میں ہم اسے ہندی۔ اُردو یا ہندوستانی کہتے ہیں یہ زبان عام رائے سے آج بھی ہندوستان کی مشترکہ زبان مان لی گئی ہے۔ ہندوستان کی گزشتہ سو برس کی تاریخ میں سب سے زیادہ عجیب حقیقت ہندی اور اردو کے جھگڑے کی رہی ہے۔ حالانکہ ہندوستان کی کوئی دوسری دو زبانیں آپس میں اس قدر مشابہ نہیں ہیں جس قدر اُردو اور ہندی لیکن پھر بھی اُردو اور ہندی کے مسئلہ کو ایک اہم سیاسی۔ فرقہ دارانہ اور تمدنی مسئلہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پشاور سے لیکر بہار تک اور ہندوستان کے انتہائی شمالی علاقوں سے لیکر ممالک متوسط کے وسط تک ہر جگہ اُردو اور ہندی کی باہمی کشمکش متوسط طبقہ کی اُس ذہنیت کا افسوسناک نتیجہ ہے جو سمجھتی ہے کہ زبان کو قوم کی نہیں بلکہ قوم کو زبان کی خدمت کرنی چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستانی کی ان دونوں شکلوں کے متعلق اس زبردست حقیقت کو نظر انداز کر جانا کہ ان میں بہت بڑی حد تک مشابہت ہے ایک مجرمانہ فعل ہے۔ ہندی اور اُردو دونوں کے فعل ایک ہی ہیں حروف جار بالکل ایک ہیں۔ تمام ضمیریں ایک ہیں۔ تذکیر و تانیث بالکل ایک ہے۔ بولی ٹھولی۔ محاورات۔ کہاوتیں۔ مثلیں۔ اور بات چیت کے فقرے بالکل وہی ہیں۔ ہزاروں اسم اور صفت ایک ہیں اور دس ہزار لفظ تو بالکل ایک ہیں۔ البتہ صرف ایک ہزار اسم اور صفت ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اگر وہ لوگ جو صرف اُردو جانتے ہیں پانچسو سنسکرت الفاظ اور جان جائیں اور جو ہندی سمجھتے ہیں پانچسو فارسی الفاظ سے آشنا ہو جائیں تو پھر غالباً ہندی ادب اور اُردو ادب دونوں کے لئے صد درجہ آسان ہو سکتا ہے۔ مسلم کلچر کی ہندی کی وجہ سے اور ہندو کلچر کی اُردو کی وجہ سے خطرہ میں ہونے کی یہ قابل نفرت اور احمقانہ چیخ پکار دراصل ہندوستانی بولنے والوں کی اُس ذہنیت کی وجہ سے ہے جس کے باعث وہ پانچسو سنسکرت یا فارسی الفاظ کا جاننا گوارا نہیں کرتے۔ رسم خط کے مسئلہ سے ہٹکر اُردو نثر و نظم کا ایک نہایت ہی عمدہ انتخاب اور ہندی کا بھی ایک ایسا ہی انتخاب جو ہندی اُردو کے طلباء کو چھ ماہ میں پڑھایا جا سکے۔ ہر شخص کو بیک وقت اُردو اور ہندی سمجھنے اور اُن سے لطف اندوز ہونے کے قابل بنا دیگا۔ اگر انگریزی پر مہارت حاصل کر کے مہاتما گاندھی ہندو کلچر نہیں کھو بیٹھے۔ اگر فارسی جاننے سے تلسی داس کو کوئی نقصان نہیں ہوا اگر انگریزی اور جرمنی پر انتہائی ملکہ حاصل کرنے کے بعد بھی اقبال کا مسلم کلچر نہیں گیا۔ اگر ہندی جاننے کے باوجود خسرو مسلم کلچر کی ایک روشن مثال بن سکا۔ تو پھر اس قابل افسوس نادانی اور بزدلی کو کیا کہا جائے جو دو برابر کی قوموں میں صرف پانسو الفاظ کے باب میں پائی جاتی ہے۔

میرا دعوے ہے کہ قدیم ترین عہد سے اُردو اور ہندی کا پورا ادب صرف ایک ہی تمدن کا۔ ہندی کا ایک ایم۔ اے جو سنسکرت نہ جانتا ہو تقریباً پورا اُردو ادب سمجھ سکتا ہے اور سنسکرت کا ایک آدھا صفحہ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح ایک اُردو کا ایم۔ اے یا اُردو کا بڑا مصنف جو فارسی یا عربی نہ جانتا ہو پورا ہندی ادب بخوبی سمجھ اور پسند کر سکتا ہے لیکن فارسی کا آدھا صفحہ یا عربی کی آدھی سطر بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اگر ویدوں کے رشی اور پورانوں کے مصنف۔ اگر سیانا۔ مہی دھارا اور دیانند سرسوتی بدھ۔ شنکراچاریہ۔ درشنوں کے مصنف یا شکتی اور چارکیہ فلسفہ کے مصنف۔ جینیوں کے نبی۔ چیتنہ۔ تلسی داس۔ والمیکی۔ نانک اور ویاس۔ رام موہن رائے وجے۔ سی بوس۔ مہادیوی ورما۔ ٹورودت اور سروجنی نیڈو۔ میکائیل مادھوسودن دتا۔ رابندر ناتھ ٹیگور۔ جواہر لال نہرو اور گاندھی۔ چاندبی بی۔ لکشمی بائی۔ لارڈ مسٹہا اور موتی لال نہرو۔ سب ایک ہی تمدن کی نمایندگی کرتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ بابر۔ اورنگ زیب۔ ابوالفضل فیضی۔ اکبر۔ بیربل۔ رانا پرتاب اور شیواجی۔ نورجہاں اور اہلیا بائی۔ تان سین اور چیتنائی۔ خسرو۔ ابن بطوطہ۔ عرفی اور میرزا بیدل۔ ولی۔ میر اور غالب۔ آتش۔ انیس۔ سرسید۔ محمد علی۔ داغ اور حالی۔ اکبر اور جوش ملیح آبادی۔ جناح اور مالویہ۔ دادا بھائی نوروجی اور بدرالدین طیب جی بھی اُسی کلچر کے علمبردار ہیں اور تاریخ اس بنیادی احساس کو صدیوں کی جنگ و کشمکش۔ آپسی دشمنی و شبہات کے دور سے گزرنے کے بعد رفتہ رفتہ برآمد کر رہی ہے اور اس احساس کی قیمت ہم نے اپنے خون سے ادا کی ہے۔ اپنی تاریخ پر فخر کرے اور اس کا اطمینان و جرأت کے ساتھ مطالعہ کرنے کا مادہ ہمارے اندر آج ہی کل میں پیدا ہوا ہے۔ آج ہم قطعی طور سے لیکن بالکل فضول ذرا ڈرے سے ہوتے ہیں اور یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ متضاد چیزوں کا یہ باہمی میل جول ہم کو خوش تو کرتا ہے لیکن اسی راستے میں مشکلیں اور تکلیفیں بھی پیش آتی ہیں۔ راسخ عقیدے اور یقین کچھ اس طرح پیدا ہو رہے ہیں کہ موجودہ طریقۂ زندگی اکثر شدید خطروں میں پڑ جاتی ہے۔۔۔ کارلائل نے کہا تھا کہ "ہندوستان کی سلطنت رہے یا نہ رہے لیکن ہم اپنے شیکسپیر کو نہیں گنوا سکتے۔" اسی طرح فرد بند اور جماعتی تمدن رہے یا نہ رہے لیکن ہم اپنے روشن ماضی اور اس کے حیات بخش ورثہ کو معرض خطر میں نہیں ڈال سکتے اور تمدنی حد بندی کی تمام کوششیں دراصل ہندوستان کی تاریخ سے زبردست غداری کی مترادف ہیں اور اسکے معنے ہیں کہ ہندوستانی قوم کے اعضا جیتے جی تراشے جا رہے ہیں۔

آیئے اب ہم پورے ہندوستان کے لئے ہندوستانی اور دوسری زبانوں کے رسم خط کے مسئلہ پر غور کریں۔ ہم کو اپنی ادبی پیداوار کا تصور اس طرح کرنا ہے کہ اسے عوام کے لئے بڑی مقدار میں اور نہایت سرعت سے پیدا کرنا ہے اور ہندوستان میں ایک درجن سے زاید طرح کے رسم خط جاری رکھنے کا

طریقہ زیادہ قایم نہیں رہ سکتا اگر آپ اپنے ذہن کے نیم شعوری اثرات کا تصور کریں جبکہ آپ کوئی انگریزی اخبار یا کوئی ہندوستانی رسم خط کی کتاب پڑھتے ہیں تو غالباً آپ مجھ سے خود بخود متفق ہو جائیں گے۔ آپ سوچئے ان میں سے کون سا رسم خط فطری طور پر آپ جلد تر پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں تقریباً بغیر مستثنیات کے انگریزی کتاب۔ انگریزی اخبار اور انگریزی خط پر سے ہماری نظریں پہلے اور جلد تر دوڑ جائیں گی۔ میں نے یونیورسٹی کے اپنے کچھ طالبعلموں سے یہی سوال کیا۔ بعضوں نے اس امر پر بالکل غور ہی نہیں کیا تھا۔ کچھ طلباء نے جنمیں اُردو اور ہندی کے بعض پرجوش حمایتی بھی تھے ذرا تعجب اور کچھ ہلکی سی دلی چوٹ کے ساتھ یہ تسلیم کیا کہ انگریزی رسم خط بہت آسانی سے پڑھ سکتے ہیں اور یہ اقرار کسی طرح بھی غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ نہیں ہے۔ روشن حروف تہجی آسان ترین حروف ہیں۔ ہر حرف نہایت سادے نشانات سے ملکر بنتا ہے۔ فارسی ناگری اور دوسرے ہندوستانی حروف تہجی میں بہت سے دایروں آڑی ترچھی شکلوں اور زاویوں سے گزرنا پڑتا ہے اور دماغ پر اس تمام پیچ در پیچ عمل کا کافی بوجھ پڑتا ہے۔ یہ یورپ کی اندھی تقلید نہیں تھی کہ کمال اتاترک نے ترکی رسم خط ترک کر کے رومن رسم خط اختیار کیا کیونکہ اگر ترکی رسم خط آسان تر۔ سادہ اور زیادہ جلدی سے سیکھا جا سکتا تو اتاترک ایسا قومی انسان کبھی اس کو ترک نہیں کر سکتا تھا۔ اگر ترکی میں یہ غیر معمولی تبدیلی ہو سکتی ہے تو پھر ہم ہندوستان میں اپنے چالیس کروڑ قارئین کی کہیں زیادہ شدید مشکلات دور کرنے کے لئے رومن رسم خط کیوں نہیں اختیار کر سکتے؟ اس امر پر غور کرتے ہوئے میں پھر یاد دلاؤں گا کہ ہم کو ادب اور ملک کی پوری ذہنی زندگی کی از سر نو تعمیر کرنی ہے۔ شارٹ ہینڈ۔ ٹائپ۔ چھپائی۔ اخبار اور کتابوں کی پیداوار آج سے پچاس گنا زیادہ اضافہ کرنا ہے۔ اب اگر دونوں طرح کے رسم خط میں محنت کے لحاظ سے مقابلہ کیا جائے تو اتنے ہی آدمیوں مشینوں۔ کام کے گھنٹوں اور مزدوری میں رومن رسم خط کے ذریعہ اُردو اور ہندی کے مقابلہ میں میں دُگنا کام ہو سکتا ہے۔ کاغذ کا صرف بھی مقابلۃً آدھا ہی ہوگا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا یا کسی بڑی ڈکشنری کا تصور کیجئے۔ بڑی کتابوں کے طویل سلسلوں یا یورپین اخباروں اور رسالوں کے سے بڑے بڑے رسالوں اور اخباروں کو سوچئے اور پھر خیال کیجئے کہ اُردو یا ہندی رسم خط میں ان کے چھپنے سے کس قدر روپیہ اور وقت کی بربادی ہوتی ہے۔ ہمارے امتحانوں میں ہندی۔ اُردو اور انگریزی پرچوں کا وقت عموماً تین گھنٹے ہوا کرتا ہے اگر آپ سب سے زیادہ تیز لکھنے والے کی کاپی میں الفاظ کی تعداد کو دیکھئے تو انگریزی کے الفاظ اُردو اور ہندی کے پرچوں میں اُردو اور ہندی کے الفاظ سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ ہمارے ناگری اور فارسی رسم خط اچھے اور خوبصورت رسم خط سہی لیکن ان کے حروف تہجی اور حروف کا امتزاج اور ملاؤ کا طریقہ ضرورت سے زیادہ مزین و آراستہ ہو گیا ہے اس کے علاوہ رومن حروف تہجی اس قدر بھدے اور بے جان بھی نہیں

جتنا بعضوں کا خیال ہے۔ رومن رسم خط کی بھی بہت سی ایسی "صورتیں" ہوتی ہیں جو کافی دلکش ہوتی ہیں پھر ہندوستانی ادب کا رسم خط سے کوئی تاریخی تعلق بھی نہیں ہے۔ تلسی داس اور غالب نے اگر صرف رومن رسم خط پڑھا اور لکھا ہوتا تو بھی ان کی غیر فانی سخنوری میں کوئی فرق نہ آتا۔ ہندی کے تمام بڑے مسلمان شاعروں نے اپنے شعر۔ دوہے اور نظمیں ہندی نہیں بلکہ فارسی رسم خط میں لکھی ہیں اور آج بھی اردو کی بہت سی معیاری کتابیں ناگری رسم خط میں شایع ہوکر فروخت ہو رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں جیسا میں نے عرض کیا کہ عوام کے لئے زیادہ مقدار میں اور سرعت کے ساتھ ادب پیدا کرنے کے نقطۂ نگاہ سے غور کرنا چاہیئے اور ان دونوں ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر آپ کوئی رائے قایم کریں تو ہندوستانی ادب کو ترقی دینے کے لئے غالباً آپ رومن رسم خط منظور کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ وہ دن جبکہ ہندوستان اس تجویز کو متحدہ طریقہ سے منظور کریگا تو ہندوستان کے دشمن اور اس کے بدنیتی غارتگر کانپ اٹھیں گے۔ سارے ہندوستان میں رومن رسم خط قایم ہونے سے برطانوی سامراج کو اپنے سیاسی مستقبل کی طرف سے ایک ناامیدی کا ساجذبہ پیدا ہو جائے گا۔ رومن رسم خط کے باعث اُن ہزاروں شاعروں اور نثر نگاروں کی محنت جنھوں نے ہندوستانی زبانوں میں صدیوں پہلے تصنیفات کی ہیں درجۂ تکمیل کو پہونچ جائے گی اور معلوم نہیں صحیح یا غلط لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ملک میں رومن رسم خط کی مخالفت روز بروز کمزور تر ہوتی جا رہی ہے اور اگر میں میلان وقت کا صحیح اندازہ لگا سکتا ہوں تو غالباً ہم ایک نسل گزرنے سے پہلے اسی رسم خط کو رائج کرلیں گے۔

احمد حسین

نگار کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں :-

(۱۹۲۶ء) جنوری ۵ر- (۱۹۲۷ء) اپریل ۴ر- (۱۹۳۰ء) مئی ۴ر- (۱۹۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ (۱۹۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ- (۱۹۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر فی پرچہ- (۱۹۳۴ء) فروری و اکتوبر ۴ر فی پرچہ (۱۹۳۵ء) فروری، اپریل تا اگست، اکتوبر تا دسمبر ۵ر فی پرچہ- (۱۹۳۶ء) فروری، مارچ، اپریل، مئی، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۵ر فی پرچہ- (۱۹۳۷ء) مارچ اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، نومبر ۸ر فی پرچہ-

مینجر نگار لکھنؤ

عہدِ تغلق کے سکّے

دنیا میں جب مدن و معیشت کا کوئی نظم نہ تھا، خرید و فروخت کا کوئی اُصول نہ بنا تھا تاہم باہمی تبادلہ کا ایک طریقہ مروج تھا۔ چنانچہ عرب اور ایران، مصر اور ہندوستان میں مونگا، مشک اور نیشکر مسالے ملبوسات غلہ اور اسی قبیل کی اور بہت سی چیزوں کا ایک دوسرے سے تبادلہ ہوتا تھا اور یونان جو علوم و فنون کا گہوارہ تھا وہاں بھی شرح تبادلہ کا یہی حال تھا، البتہ غیر مضروب سکوں کا رواج مسیح سے چند سال پہلے بابل میں ہوا اور شروع شروع تبادلہ مال بالاشیاء کا قاعدہ وہیں مرتب ہوا (طبقات ناصری) اور رفتہ رفتہ سکوں نے رواج پایا چنانچہ عہد تغلق کے وہ سکے جو چھٹی صدی ہجری سے حکومتِ مغلیہ کے زوال تک ہندوستان میں رائج تھے وہ سب گزشتہ کاوشوں کے مرہون منت تھے، یہاں کرنسی نوٹوں کا استعمال نہ تھا البتہ تانبہ پیتل کے سکوں کا رواج چین اور ایران کی طرح یہاں بھی ہوا چنانچہ آخر عہد تغلق میں جیتل کا یہاں رواج ہوا لیکن چند دنوں کے بعد منسوخ ہو گیا۔ چین میں کرنسی نوٹوں کا رواج نوی صدی عیسوی میں ہوا۔ یہ نوٹ شہتوت کے درخت کی چھال سے طیار کئے جاتے تھے۔ یہ مربع شکل کے ٹکڑے ہوتے تھے جن پر قیمت لکھ دیجاتی تھی اور مختلف عہدہ داروں کے اس پر دستخط ہو جاتے تھے۔ آخر میں شاہی مہر سرخ روشنائی سے ثبت ہوتی تھی، اگر کوئی شخص اس کے لینے سے انکار کرتا تو اس کو سخت سزا دیجاتی تھی، اگر کسی کو زیورات کے لئے سونا اور چاندی کی ضرورت ہوتی تو درخواست دینے پر بینک سے ملجاتی تھی، اگر نوٹ بوسیدہ ہو جاتا تھا تو تین فیصدی قیمت وضع کر کے نیا نوٹ ملجاتا تھا، (سفرنامہ مارکوپولو) یہ نوٹ ہر قیمت کے ہوتے تھے (سفرنامہ ابن بطوطہ) کرنیل یول نے ایک نوٹ ینگ خاندان کے اول حکمراں کا جو ۱۲۶۶ء میں چین کے تخت و تاج کا مالک ہوا تھا، کہیں سے حاصل کیا، اس کی تصویر مع اصلی رنگوں کے مارکوپولو کے سفرنامہ میں موجود ہے، ان نوٹوں پر یہ مرقوم تھا کہ جو کوئی جعلی بنائے گا اس کو قتل کیا جائے گا اور جو کوئی جعل بنانے والے کی مخبری کرے گا اس کو دو سو پچاس نیتال انعام میں دئے جائیں گے اور مجرم کی کل جایداد منقولہ وغیر منقولہ اس کو بخش دیجائے گی، (سفرنامہ مارکوپولو) ابن بطوطہ نے نوٹوں کا نام بالشت لکھا ہے لیکن اصل میں نوٹوں کو چاؤ کہتے تھے اور بالشت فقط ایک سکہ کا نام تھا (مسالک الابصار) جو دینار سے کم مقدار کا تھا،

(طبقات اکبری) لیکن مغلوں کے خاندان کے بعد ان نوٹوں کا رواج کم ہوتا گیا اور ۱۴۵۹ء میں بالکل ختم ہو گیا۔ کتجا تو خاں نے اپنے خزانہ کی کمی پوری کرنے کے لئے ایران میں ۱۲۹۴ء میں اپنے وزیر اعزالدین کے مشورہ سے چاؤ خانے جاری کئے۔

لیکن سلطان خازان خاں نے جو خراسان کا بادشاہ تھا اپنے دارالخلافہ میں ان نوٹوں کو داخل ہونے نہیں دیا اور تمام ملک میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرایا۔ ایران اور چین کے نوٹوں کا حال سُنکر شاہ تغلق نے بھی بجائے سونا اور چاندی کے تانبہ اور پیتل کے سکے چلائے۔ تعجب ہے کہ ابن بطوطہ نے اس کا کہیں تذکرہ نہیں کیا حالانکہ جسکے آنے سے قبل ۷۳۰ھ و ۷۳۱ھ میں یہ سکے جاری تھے، ان سکوں کا نمونہ یہ ہے:۔

مہر شد تنکہ راع در روزگار — من اطاع السلطان
بندہ امید وار محمد تغلق — فقد اطاع الرحمٰن،
در تخت گاہ دولت آباد سال مفتصدسی

تاریخ مبارک شاہی کے مصنف کا خیال ہے کہ سلطان محمد تغلق نے کتجا تو خاں کی تقلید میں خزانے کی میزانیہ برابر کرنے کے لئے یہ سکے جاری نہیں کئے تھے جیسا کہ بعض مورخین کا گمان ہے، بلکہ اس کی مراد یہ تھی کہ بجائے سونے اور چاندی کے پیتل اور تانبہ کے سکے فقط شاہی اعتبار پر چلائے جائیں۔ مگر چونکہ پیتل کے سکوں کا بنانا بہت آسان تھا اس لئے ہر سنار نے اپنے گھر میں دارالضرب بنالی، یہ بھی بادشاہ کی نیک نیتی تھی کہ جب اس نے دیکھا کہ یہ کام نہیں چل سکتا ہے تو چاندی اور سونا دیکر یہ تمام سکے واپس لے لئے جس کی وجہ سے اس کا خزانہ خالی ہو گیا صاحب تاریخ مبارک شاہی کے وقت میں قلعہ تغلق آباد میں ان سکوں کے انبار تھے۔

میں کہاں سے کہاں پہونچا، کہنا یہ چاہتا تھا کہ محمد ابن تغلق شاہ کے وقت میں جو سکے مروج تھے انکی نوعیت کیا تھی، اقتصادیات پر ان کا کیا اثر تھا۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں کس قسم کے سکے اور کس شرح مالیت کے جاری تھے اس کا پتہ تاریخی کتابوں سے نہیں چلتا۔ لیکن غیر ممالک کے سیاحوں کی تحریروں سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ جب مسلمان اول اول ہندوستان میں آئے تو یہاں زیادہ تر ایک سکہ کا رواج تھا جس کو دلی وال کہتے ہیں اور وہ جیتل کے برابر ہوتا تھا چنانچہ تاج المآثر کا مصنف اسی لفظ کو استعمال کرتا ہے شمس سراج عفیف یعنی طبقات ناصری کا مصنف جیتل اور ٹنکہ دونوں کا ذکر کرتا ہے ان کے علاوہ اور کسی سکہ کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں سکوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ شاندار زمانہ محمد ابن تغلق شاہ کا ہے اور غالباً اس کے عہد میں اس کی تکمیل ہو چکی تھی۔

غیاث الدین محمد ابن تغلق شاہ جب ۷۵۲ھ (۱۳۵۴ء) میں تخت پر بیٹھا تو اسے یہ خیال پیدا ہوا

کہ آل عباس کے خلفاء چونکہ برحق ہیں اس لئے کوئی شخص بغیر ان کی اجازت کے مسلمانوں کا صحیح قاید نہیں ہوسکتا ہے۔ ان دنوں خلفائے عباسیہ کی حکومت برائے نام تھی، وہ اسی کو غنیمت سمجھتے تھے اور یہ خیال کرکے کہ بغیر ان کی مرضی کے کوئی مسلمانوں پر حکومت نہ کرے، اکثر انقیادی نشانات دیدیتے تھے اور سلاطین غزنیہ وغوریہ میں سے اکثر نے سکہ پر بھی خلیفہ وقت کے نام درج کرائے اور بعض ایسے بھی تھے جو باوجودیکہ سند نہ رکھتے تھے مگر پھر بھی ناصر امیر المومنین، قسیم امیر المومنین، ولی امیر المومنین سکہ کے دوسری طرف کندہ کراتے۔ امیر المومنین سے اُن کی مراد عباسیہ کا خلیفۂ وقت ہوتا تھا، چنانچہ قطب صاحب کی لاٹ پر "مظہر کلمۃ العلیا ابو المظفر محمد ابن سام قسیم امیر المومنین خلد اللہ ملکہ" اور جامع مسجد کے دروازے کے کتبہ پر "معز الدنیا والدین محمد بن سام ناصر امیر المومنین" اور سلطان معز الدین غوری کے دینار کے ایک طرف "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ الناصر الدین للہ امیر المومنین" اور التمش کے تنکہ کے ایک رخ پر "فی عہد الامام المستنصر امیر المومنین" کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ ناصر الدین محمود ابن التمش اور رضیہ سلطانہ کے سکوں پر بھی یہی الفاظ پائے جاتے ہیں جب بغداد کا آخری خلیفہ المستعصم باللہ ۶۵۶ھ میں قتل ہوگیا اور خلافت کا خاتمہ ہوگیا تب بھی ۶۸۰ھ کے سکون پر جو غیاث الدین کے وقت میں مضروب ہوئے تھے، الامام المستعصم امیر المومنین منقوش ہے۔ یہ دراصل خوش اعتقادی تھی ورنہ خلیفہ کے مارے جانے کی خبر ایسی نہ تھی کہ پردۂ راز میں رہتی، گڈھ مکتیسر کی مسجد کے کتبہ میں جو سلطان غیاث الدین بلبن کے وقت میں تعمیر ہوئی تھی "غیاث الدنیا والدین ابو المظفر بلبن السلطان ناصر امیر المومنین ۶۸۲ھ" درج ہے۔ بلکہ جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے وقت میں جو سکے ڈھلے ہیں اور ۶۹۱ھ تک پائے گئے ہیں، ان کے ایک رخ پر "الامام المستعصم امیر المومنین" تحریر ہے، اور یہ حال ۶۹۵ھ تک رہا، علاء الدین خلجی کے سکوں پر "سکندر ثانی یمین الخلافۃ ناصر امیر المومنین ۷۰۹ھ" لکھا جاتا تھا، لیکن اسکا خلف اکبر قطب الدین مبارک شاہ خود ہی امام اور امیر المومنین بن بیٹھا، چنانچہ اس کے سکہ کے ایک طرف "الامام الاعظم خلیفہ رب العالمین قطب الدنیا والدین ابو المظفر مبارک شاہ" اور دوسری طرف "السلطان ابن السلطان الواثق باللہ امیر المومنین ۷۱۸ھ" درج ہے، خسرو نومسلم اپنے سکوں پر بذات خود "ولی امیر المومنین" اور غیاث الدین تغلق "ناصر امیر المومنین" ہمیشہ لکھتے رہے۔ شاہان بنگالہ ۷۱۱ھ تک "الامام المستعصم امیر المومنین" لکھتے رہے، سلطان محمد تغلق نے ۷۴۱ھ تک اپنے سکوں میں نہ تو کسی خلیفہ کا نام لکھا اور نہ اپنے کو امیر المومنین سمجھا، لیکن بعد کو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ خلیفہ کی اجازت کے بغیر بادشاہی کرنا درست نہیں چنانچہ اس نے غائبانہ بادشاہ کے نام پر بیعت کی اور سکوں میں اس کا نام منقوش کرایا اور ایک درخواست اسکے پاس بھیجی (سفرنامہ ابن بطوطہ) ۷۴۱ھ میں خلیفہ المستکفی باللہ مرچکا تھا لیکن ہندوستان میں اس کے

مرنے کی خبر اسوقت تک نہیں پہونچی تھی جب تک کہ خلیفہ کا قاصد سعید صرصری ۷۴۴ھ میں اجازت نامہ لیکر واپس نہ آیا محمد بن تغلق ۷۴۲ھ و ۷۴۳ھ و ۷۴۴ھ کے سکوں پر بھی المستکفی باللہ کا نام درج کراتا رہا، المستکفی باللہ کے بعد ابراہیم واثق باللہ بھی تخت خلافت پر بیٹھا مگر ایک سال کے بعد اس دنیا سے رحلت کر گیا اس کی جگہ پر ابوالعباس احمد الحاکم بامراللہ ۷۴۱ھ میں خلیفہ ہوا مگر ہندوستان میں اس کے جلوس کی خبر نہیں پہونچی، حاجی سعید صرصری کے آنے کے بعد بادشاہ نے حاجی رجب کو پھر خلیفہ کے پاس بھیجا، ضیاء برنی نے حاجی سعید کی آمد کی تاریخ ۷۴۴ھ لکھی ہے اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ دو سال کے بعد حاجی رجب اور شیخ رکن الدین آئے، بدر چاچ سے اسکی صحت ہو جاتی ہے

ہم بتاریخے کہ ماہ از سال ہفصد شد فزوں رجب ۷۴۶ھ
زیں سفر ماہِ محرم سابق (یعنی رجب) شعباں رسید

فرشتہ نے حاجی سعید صرصری اور حاجی رجب کے آنے کا حاصل مفصل لکھا ہے۔ لیکن ابن بطوطہ نے حاجی سعید کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے اور شیخ رکن الدین کا ذکر بہت مختصر صرف چند سطروں میں ضرور کیا ہے لیکن اس سے کسی اور شے کا علم نہیں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ مجھے صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ حاجی سعید صرصری کے آنے سے قبل جزائر مالدیپ کی طرف روانہ ہو چکا تھا اور شیخ رکن الدین کا حال یا اُسے معبر میں معلوم ہوا یا چین سے واپس آکر عرب و شام میں۔ جسوقت محمد تغلق شاہ تخت پر جلوہ آرا ہوا اسوقت یا اس کے کچھ دنوں کے بعد یہاں کے بازاروں میں مختلف قسم اور مختلف نوعیت اور مالیت کے سکے مروج تھے جنکی تفصیل یہ ہے:-

(الف) دینار طلائی، وزن ½ ۱۹۸ گرین۔ دہلی ۷۲۵ھ و ۷۲۶ھ و ۷۲۷ھ اس کے ایک سمت یہ عبارت مرقوم تھی "اشہدان لاالہ الااللہ واشہدان محمداً عبدہ ورسولہ" اور حاشیہ پر یہ مسطور تھا "ضرب ہذا الدینار بحضرۃ دہلی سنۃ سبع وعشرین وسبعمائۃ گویا ۷۲۷ھ میں یہ دینار مضروب ہوا۔

(ب) دینار طلائی۔ وزن ½ ۱۹۸ گرین ہے۔ ۷۲۷ھ ضرب فی زمن العبد الراجی رحمۃ اللہ علیہ محمد ابن تغلق، ایک رخ پر منقوش تھا اور دوسری طرف "لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ" اور حاشیہ پر یہ لکھا ہوا تھا "ہذا الدینار بحضرۃ دہلی فی سنۃ سبع وعشرین سبعمائۃ" لکھا ہوا تھا۔ گویا یہ بھی دہلی ہی میں ۷۲۷ھ میں مضروب ہوا تھا۔

(ج) دینار طلائی نصفی - وزن ۹۹ گرین دہلی، ایک طرف "محی سنن خاتم النبیین" درج تھا اور دوسری طرف "محمد ابن تغلق شاہ" حاشیہ کا کچھ علم نہیں ہے کہ اس پر کیا درج تھا۔

(د) تنکہ پنجاہ کانی۔ پیتل۔ وزن ۱۳۲ گرین (چاندی کے سکے کی جگہ پیتل کے سکے محمد ابن تغلق شاہ نے اپنے حکم سے چلائے جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں کہ اس کے رائج کرنے میں بادشاہ کو بہت بڑا خسارہ ہوا اور اس کا خزانہ

خالی ہوگیا) دولت آباد ۷۳۱ھ مہر شد تنکہ پنجاہ کانی ذر روزگار بندہ امید وار محمد ابن تغلق، ایک سمت درج تھا اور دوسری جانب "من اطاع السلطان فقد اطاع الرحمٰن" تحریر تھا اور حاشیہ پر "در تخت گاہ دولت آباد" درج تھا۔

(ہ) تنکہ نصفی تانبہ۔ وزن ۱۰۳ گرین۔ دولت آباد ۷۳۰ھ جو چاندی کے سکوں کا نعم البدل بھیجا گیا اور بازاروں میں اس کی جگہ پر مستعمل ہوا، سکہ کے ایک رخ پر یہ کندہ تھا "ضرب ہذہ النصفی فی زمن العبد الراجی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے رخ پر "محمد تغلق بحضرت دولت آباد سنہ ثلثین سبعمائۃ" درج تھا۔

(و) سکہ دوکانی۔ وزن ۲۵ گرین۔ ایک طرف 'سکہ دوکانی' اور دوسری جانب محمد تغلق' درج تھا۔

(ز) سکہ جیتل۔ تانبہ۔ وزن ۴۷ گرین اسکوانانی' اور دیکانی' بھی کہتے ہیں۔

الغرض اسوقت سات قسم کے سکے مروج تھے، زائد کا علم نہیں، تاریخیں اس باب میں خاموش ہیں، اسوقت فرشتہ، طبقات ناصری، تاج المآثر، سفرنامہ ابن بطوطہ و سفرنامہ مارکوپولو، مسالک الابصار، طبقات اکبری، فتوحات فیروز شاہی، تاریخ فیروز شاہی، آئین اکبری میرے سامنے ہیں، ان کے علاوہ اور جن کتابوں کی ضرورت ہوئی۔ ان کی چھان بین کی، لیکن کوئی زیادہ معلومات حاصل نہ ہوسکی۔ ابوالقاسم فرشتہ علاء الدین خلجی کے حال میں لکھتا ہے:۔

دار وقت تنکہ یک تولہ طلا و نقرہ مسکوک را می گفتند و ہر تنکہ نقرہ را پنجاہ پول مس کہ جیتل می گفتند دمی دادند اما وزن آں معلوم نیست کہ چہ مقدار بود بعضے بر انند کہ یک تولہ مس و بعضے گویند کہ مثل آں پول ایں زماں دو تولہ ربع کم۔

شیر شاہ کے وقت سے روپیہ کا استعمال شروع ہوتا ہے اور اسی بادشاہ کے عہد میں تانبہ کے سکے مضروب ہوئے ورنہ اس سے قبل تانبہ کے سکوں میں چاندی کا جز کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا تھا، بابر اور سکندر لودھی کے وقت کا تنکہ سیاہ، نقرئی تنکہ کے بیسویں حصہ کے مساوی تھا یعنی بہلولی سکہ کے متوازی، بہلول کا وزن ایک تولہ ۸ ماشہ، رتی تھا، ایک تنکہ سفید کے چالیس بہلولی آتے تھے اس بہلولی کو اکبر کے وقت میں دام کہتے تھے، ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے:۔

دام مسیں نقد بست وزن نج ٹانک کہ یک تولچہ و ہشت ماشہ و ہفت نرخ باشد بخش روپیہ نخست ازاں پیہ گفتہ و بہلولی، نیز خواندند و امروز بدام اشتہار دارد یک سو ضرب فلاں جائے و دیگر جانب سال دہ۔ (آئین اکبری)

ابن بطوطہ نے معلوم نہیں قرضہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں کس تنکہ کا ذکر کیا ہے، میرے خیال میں تنکہ سے اس کی مراد تنکہ سرخ (اشرفی) ہے اور دینار سے نقرہ سفید (روپیہ) ہے جیسا کہ اس کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ یہاں عربی کے بجائے سہولت فہم کے لئے اردو میں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

شام کے وقت جب میں گھر آیا تو میں نے تین تھیلیوں میں چھ ہزار دو سو تینتیس تنکے پائے پچیس ہزار دینار تو مجھے قرض میں دیئے تھے اور بارہ ہزار دینار کے انعام کا حکم ہو چکا تھا اور رقم عشر وضع کرنے کے بعد بچ رہی تھی، تنکہ مغرب کے دینار طلائی کے برابر ہوتا ہے۔ (سفرنامہ ابن بطوطہ)

جب ۶۷ ہزار دینار کا عشر ۶۷۰۰ دینار ہوتا ہے تو عشر وضع کرنے کے بعد ۶۰۳۰۰ دینار ملنا چاہئے اگر تنکہ سرخ اور سفید کا نرخ ایک اور دس ہے، جیسا کہ وہ لکھتا ہے تو پھر چھ ہزار تیس تنکے ملنا چاہئیں لیکن دو سو تیس تنکے زیادہ آئے ہیں لہذا اس حساب سے معلوم ہوا کہ اُن دنوں اس کا نرخ ایک اور دس سے کچھ کم تھا۔

ہندوستان کے قدیم زمانوں میں جبکہ تنکہ رائج تھا، اس وقت مورخین کو اس کی شرح حالت معلوم کرنے کی ضرورت نہ محسوس ہوئی اور پچھلے مورخین باوجود تحقیق و تفتیش ناکام رہے۔ تاہم غیر ممالک کے مسافروں کی تحریروں سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ جب اول اول مسلمان ہندوستان میں آئے تو یہاں زیادہ تر ایک سکہ مروج تھا جس کو دلی وال کہتے ہیں، وہ جیتل کے برابر تھا، چنانچہ تاج المآثر کا مصنف اسی لفظ کو استعمال کرتا ہے اور شمس سراج عفیف یعنی طبقات ناصری کا مصنف جیتل اور تنکہ دونوں لکھتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے سکوں پر جو ۴۱۸ھ کے ہیں، درہم اور تنکہ یعنی ایک لفظ عربی اور دوسرا سنسکرت کا درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے۔ تنکہ ہندوستانی لفظ ہے ترکی نہیں جیسا کہ بعض کا خیال ہے، شروع میں تنکہ نقرہ اور تنکہ طلائی وزن میں ۱۷۵ اگرین یعنی سو رتی کے تھے، لیکن سلطان محمد تغلق نے ایک تنکہ نقرئی ۱۴۰ اگرین یعنی ۸۰ رتی کا بھی چلایا، غالباً اسی کو ابن بطوطہ درہمی دینار کہتا ہے اور معمولی تنکہ نقرہ کو دینار مسالک الابصار کا مصنف لکھتا ہے کہ طلائی تنکہ تین مثقال کا ہوتا تھا اور نقرئی تنکہ کی آٹھ ہشتگانیاں آتی تھیں اور ایک ہشتگانی مصر و شام کے درہم کے برابر ہوتی تھی اور ایک ہشتگانی کی چار سلطانیاں آتی تھیں، ایک سلطانی یا دوکالی کے دو جیتل اور جیتل کے چار فلوس۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معمولی تنکہ نقرہ کے چونسٹھ جیتل ہوتے تھے اور عدلی کے پچاس۔ فرشتہ نے جو یہ لکھا ہے کہ تنکہ کے پچاس پول آتے تھے، اس سے اس کی مراد عدلی تنکہ سے ہے اور پول سے جیتل۔ اکبر شاہ کے وقت کا جیتل اس سے علٰحدہ تھا وہ ایکروپیہ کے ہزار حصہ کے برابر تھا، صاحب طبقات اکبری نے تنکہ نقرئی اور تنکہ طلائی کو علاوہ تنکہ سیاہ استعمال کیا ہے۔ سلطان محمد ابن تغلق شاہ کی عطیات کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:-

واضح باشد کہ مراد ازیں تنکہ نقرہ است کہ پارہ از مس ہم داشت و بہ ہشت تنکہ سیاہ برابر است

فرشتہ لکھتا ہے:- چنانچہ نظام الدین احمد بخشی تحقیق کردہ مراد ازیں تنکہ نقرہ است کہ پارۂ مس ہم داشت و یکے از ان تنکہا را

بن جاتا"۔ یہی ایک رونا ہے جو داستانِ پاستان کا اعادہ کرکے رویا گیا ہے۔ اور اگر یہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا، کی ماتم سرائی کی گئی ہے۔ لیکن میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ مصنف کی خیالی اسلامی تہذیب کبھی بھی وجود میں نہیں آئی۔

عرب پر ایرانی تہذیب و تمدن کا اثر رسول خدا صلعم کے زمانہ ہی سے پڑنے لگ گیا تھا۔ یہاں تک کہ ایرانی لباس تک کا رواج ہو چلا تھا۔ خود نبی کریم صلعم نے ایرانی جامہ کو شرفِ قبولیت بخشا تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں کہ اسلامی عظمت و جلال کے کمال کا دور تھا۔ غیر ملکی تمدن کا اثر اتنا بڑھ گیا تھا کہ جب حضرت فاروق اعظم بیت المقدس پہونچتے ہیں تو ان کے لئے اسلامی اور رومی لشکر کے درمیان تمیز دشوار ہو جاتی ہے عہدِ فاروقی کے اصلاحات پر ایک غیر جانبدارانہ نظر ڈالئے۔ یہ ناقابل انکار حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصلاحات میں اکثر ایسی تھیں جن کا نفاذ قیصر و کسریٰ کی حکومتوں میں ہو چکا تھا۔

اموی خلافت جس کو دبی زبان میں مصنف اسلامی حکومت کہہ گئے ہیں، کچھ ایسی حکومت تھی جس کے لئے میں تو یہی کہوں گا کہ "ہے شرط ادب زبان نہ کھلوائیں"۔ چنانچہ ایک فرانسیسی مورخ تو یہاں تک لکھ گیا ہے کہ "امویوں کی فتح اس جماعت کی فتح تھی جو اسلام کی مخالف تھی"۔ ماسوا ایک یا دو اموی خلفاء کے کون ایسا تھا جس کے عادات و اطوار میں اسلام کی بو بھی آتی ہو؟۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اموی اُٹھے تھے جنگ بدر و خندق کا بدلہ لینے کے لئے اور بدلہ لے کر رہے۔

عباسیوں کے غیر اسلامی شعار کے متعلق خود مصنف کتاب رقم طراز ہیں کہ:۔

"خلافت میں رفتہ رفتہ شہنشاہیت اور استعمار نے جگہ لے لی۔ وہی قصر ملوکیت جس کو اسلام نے منہدم کرنا چاہا تھا خلافت کے لباس میں قیصر و کسریٰ کی سنت کے موافق تعمیر ہونا شروع ہو گیا"۔

الغرض پوری تاریخ اسلام دُہرا جانے سے کہیں بھی آپ کو خالص اسلامی تہذیب نظر نہ آئے گی پھر جب حالت یہ ہو تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ رونا کاہے کا ہے۔

لیکن حقیقت بیں نظریں خوب جانتی ہیں کہ اسلام دنیا میں تہذیب و تمدن۔ زبان و لباس کا پیغام لیکر نہیں آیا تھا نبی کریم صلعم کا کبھی بھی یہ منشا نہیں تھا کہ ہماری دنیا۔ خالص عربی تہذیب میں رنگ جائے۔ بلکہ مقصود تھا مردہ اقوام عالم میں ایک نئی روح پھونک دینا۔ لوگوں کے عادات و اطوار سنوار کے فلسفۂ عمل و حرکت پر بنی نوع انسان کو گامزن کرا دینا۔ دنیا کی ترقی جو روم و فارس کے عالم جانکنی میں مبتلا رہنے کی وجہ سے رکی ہوئی تھی اُسے از سرِ نو صراطِ مستقیم پر لگا دینا اور بیشک اسلام اس میں کامیاب ہوا۔ تہذیب و تمدن کی ذمہ داری مذہب نہیں لیا کرتا۔ تمدن قوموں کے میل جول سے پیدا ہوتا ہے اور اس میں ہمیشہ تبدیلی

ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ عربی تہذیب کی ٹکر جب باہر کی دنیا سے ہوئی تو ایک تیسری تہذیب اسی قاعدہ کے تحت عرصۂ شہود میں آگئی پھر تاتاری مغلوں کے امتزاج سے اس پر ایک تیسرا رنگ چڑھ گیا۔ مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو یہاں کی خاک بھی ان کی دامنگیر ہوئی۔ اور یقیناً اپنا رنگ دکھائے بغیر نہ رہی۔ مگر غیر فطری طریقوں۔ ناعاقبت اندیشانہ اقدام اور اسلام کے مسخ ہو جانے کا بیجا خوف اس کے راستہ میں حائل رہا۔ مسلمان اُس فراخ دلی کا ثبوت نہ دے سکے جو انھوں نے ایران میں پیش کیا تھا۔ اگرچہ اس تنگ ظرفی میں برادران وطن بھی برابر کے شریک ہیں۔ ہاں اس صحرائے بے برگ و بار میں ایک سبزہ زار اور اس ظلمت زار کم نظری میں ایک شمعِ راہ۔ اکبر اعظم ضرور نمودار ہوا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کی سیاسیات کے وزن کو اس کے جانشین سنبھال نہ سکے۔

خالص اسلامی تہذیب کی بحث تو یوں ختم ہوئی اب فاضل مصنف کی تاریخ فہمی اور تاریخ دانی بھی ملاحظہ فرمائیے۔

سرسید کے زمانے تک کا جایزہ لے کر آپ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ "اگرچہ سات سو سال تک مسلسل مسلمانوں کے ہاتھ میں عنانِ حکومت رہی۔ لیکن اس مدت دراز کے بعد بھی ہندوان سے صاف نہیں ہوئے تھے اور ان کے آہنی پنجوں سے نجات پانے کے لئے کبھی تو سر میدان مقابلہ میں آجاتے اور کبھی مجرمانہ سازشیں کیا کرتے اور جب موقع ملتا مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھتے۔ اکبر کی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی سے ان کا زور بہت بڑھ گیا تھا۔ جب عالمگیر نے اکبر کی غلطیوں کو سدھارنا چاہا تو پورے ہندوستان میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ جب تک عالمگیر زندہ رہا معاملات بد سے بدتر نہ ہونے پائے۔ لیکن اس کے بعد ہی ہندوؤں کی آتشِ قہر و غضب کچھ اس طرح بھڑکی کہ دولت مغلیہ خاکستر ہو کے رہ گئی۔

اسی اثناء میں انگریز ہندوستان کے سیاسی بساط پر نمودار ہوئے۔ ہندوؤں نے ان کا ساتھ دیا اور ہندوستان انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء میں غلامی کے طوق کو گلے سے نکال پھینکنے کی ایک جانتوڑ کوشش کی۔ لیکن ہندوؤں کی غداریوں نے ایک نہ چلنے دی اور ہندوستان اُس حال کو لگ گیا جس سے آج تک نجات نصیب نہیں ہوئی ہے"۔ یہ ہے لب لباب تقریباً چالیس صفحہ پر پھیلی ہوئی داستان کا۔ پھر میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس سے زیادہ مکروہ تصویر مسلمان حاکموں کی کوئی اور پیش کی جا سکتی ہے۔ کیا سات سو سال تک حکومت کرنے کے بعد بھی مسلمانوں کو حکومت کا سلیقہ حاصل نہ ہونا اس قوم کا کوئی بڑا کارنامہ ہے اور کیا ڈاکٹر موںجے اسلامی حکومت کا اس سے کریہہ تر مرقع کھینچ سکتے تھے

بات یہ ہے کہ جھوٹ کو سچ بنانے کی رو میں فاضل مورخ وہ سب کچھ کہہ گئے جو آج تک متعصب سے متعصب ہندو کے ذہن میں بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن اہل نظر سے پوشیدہ نہیں کہ واقعات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قایم ہو جانے کے بعد مسلمانوں کے حسن تدبر اور مساویانہ طرز عمل کے ہندو اس درجہ گرویدہ ہو گئے تھے کہ دو چار ظالم و جابر بادشاہوں کے ظلم و تعدی آمیز پالیسی پر بھی طرح دے گئے اور ایک بار بھی محض اس بنا پر مسلمانوں سے گردن تابی نہیں کی کہ وہ مسلمان اور یہ ہندو تھے۔ ورنہ عہد مغلیہ میں ہندو اتنے جلیل القدر عہدوں پر ممتاز نظر نہ آتے۔ ارشاد ہوتا ہے "جب اورنگ زیب نے اکبر کی غلطیوں کا (مصنف کے اسلامی نقطۂ نظر سے) ازالہ کرنا چاہا۔ تو ہندوؤں کی حمایت میں شیواجی اُٹھ کھڑا ہوا" کوشش یہ ثابت کرنے کی کی گئی ہے کہ یہ خالص فرقہ وارانہ جنگ تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ مصنف کی باریک بیں نظر یہ دیکھنے سے قاصر رہی کہ شیواجی کے مقابلہ میں جو شخص بھیجا جاتا ہے۔ وہ کوئی مسلمان نہیں بلکہ ایک ہندو ہوتا ہے اور لشکر بھی خالص اسلامی نہیں بلکہ اس میں بھی ہندوؤں کی ہی کثرت ہوتی ہے یعنی مہاراجہ جے سنگھ اور اُس کے راجپوت سورما۔ اور انھوں نے کامیابی بھی وہ حاصل کی جو نہ تو ان کے قبل اور نہ ان کے بعد کسی دوسرے سپہ سالار کو ہو سکی۔ شیواجی کی گرفتاری کا سہرا بھی جے سنگھ ہی کے سر بندھا۔ اب کوئی صحیح الدماغ کیسے باور کرے کہ جنگ ملکی نہیں مذہبی تھی۔ فاضل مورخ نے یہ ثابت کرنے کی انتہائی کوشش کی ہے کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا زوال، ہندوؤں کی سازشوں اور بغاوتوں سے ہوا۔ مرہٹے راجپوت اور جاٹوں نے اسلامی اقتدار کی کشتی ہی ڈبو دی۔ اور یہ سب فرقہ وارانہ جذبہ کے تحت ہوا، کاش نتیجہ پر پہونچنے سے پیشتر کتب تاریخ کا سرسری نظر سے ہی مطالعہ کر لیا ہوتا۔ لیکن ایسا کرتے ہی کیوں مقصود حقیقت نگاری نہیں زہر اُگلنا تھا۔ دل کھول کر زہر پاشی کی اور فضا کو مکدر کر کے چھوڑا۔

بیشک جاٹوں نے سر اُٹھایا۔ راجپوتوں نے علم بغاوت بلند کیا اور مرہٹوں کا خروج ہوا۔ لیکن کیوں اسکے جواب میں تاریخی شواہد متفق اللفظ ہو کر عالمگیر کی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی کو مجرم گردانتی ہیں اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ہندوؤں نے اپنی شیطنت سے سر اُٹھایا تو بھی سلطنت مغلیہ کے زوال کا سبب اس کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ جاٹ تو عالمگیر ہی کے عہد حکومت میں کچل دئے جا چکے تھے۔ مرہٹے اور راجپوت بھی عالمگیر کے بعد شاہزادہ معظم یعنی بہادر شاہ اول کی حکمت عملیوں اور محیر العقول ڈپلومیسی کے شکار ہو گئے تھے۔ اور ایک بار پھر سلطنتِ مغلیہ کے تنِ بیجاں میں جان آگئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس گھر کو گھر ہی کے چراغ سے آگ لگی، اور اگر مسلمان، مسلمانوں کی غداریوں اور ایمان فروشیوں کی داستان سننے کے لئے آمادہ ہیں تو سید برادران، چین قلیچ خاں بانی سلطنت دکن۔ علی وردی خاں، بانیِ حکومتِ بنگالہ اور سعادت علی خاں،

فرمانروائے لکھنؤ کی سازشوں، ریشہ دوانیوں اور قتل و غارت کی داستانِ خوں چکاں کا مطالعہ کیجئے۔ یہ تو گھر کے بھیدی ہوئے باہر کے مسلمان بھائیوں کا اسلامی جوش اخوت دیکھنا ہو تو نادر شاہ اور احمد شاہ کی خبر بہائے کادی کا جایزہ لیجئے۔ اسی پر انتہا نہیں ہو جاتی، غلام قادر کی شرمناک حرکتوں کا اعادہ باقی ہے شاہ عالم کے آنکھوں کی ماتم میں ہماری آنکھیں ابھی تک پرنم ہیں۔ اس کی شہادت اور ہندو مسلم رابطۂ اتحاد پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لئے خود شاہ عالم کا قطعہ موجود ہے۔

یہ تھے وہ اسباب جنھوں نے دولتِ تیموریہ کو حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہند سے مٹا دیا۔

خاندانِ مغلیہ کا چراغ گل ہوتا ہے۔ سارے ہندوستان پر اس کے دھوئیں سے تاریکی چھا جاتی ہے ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ جب یہ دھندھلکا ذرا صاف ہوتا ہے تو ستارۂ سحری کی طرح ٹیپو شہید کے جاہ و جلال کی تابانی آنکھوں کو خیرہ کئے دیتی ہے۔ آخر بغض و حسد کی ظلمت اس روشنی کو کیسے برداشت کرتی انگریزوں کی مدد سے اسے بھی گل کر دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی فاضل مورخ کی فرقہ پرست نگاہیں مرہٹوں کو ہی موردِ الزام ٹھیراتی ہیں۔ شاید اظہارِ حقیقت سے فرمانروائے دکن کی ناخوشنودی کا خوف ہو۔ لیکن ان کی یہ چشم پوشی اوراقِ تاریخ سے حکومت دکن کی غداریوں کی داستان کو نہیں مٹا سکتی۔

غدر ۵۷ء کے کارناموں کا سہرا ابھی ہمارے، باطل نواز مورخ کے قلم نے صرف مسلمانوں ہی کے سر باندھا ہے۔ لیکن ثبوت کی بے مایگی کا یہ عالم ہے کہ باغی مسلمانوں کے لیڈروں میں سے ایک نام بھی پیش نہیں کر سکے ہیں اور طرفہ تماشہ یہ کہ یہ بھی تسلیم کئے جاتے ہیں کہ دلی کے آخری تاجدار کا ہاتھ اس میں بالکل نہیں تھا۔ برخلاف اس کے ہندو باغیوں کے نام سے بچہ بچہ آشنا ہے۔ وہ کون ہندوستانی ہے جو نانا فرنویس۔ جھانسی کی رانی لکھشمی بائی۔ کنور سنگھ اور امر سنگھ کو نہیں جانتا اور کیا ہندو مسلم اتحاد اور رواداری کی اس سے بہتر مثال دنیا پیش کر سکتی ہے کہ تمام باغی بلا لحاظ مذہب و ملت شاہ دلی ہی کے نام پر اُٹھے تھے اور اُسی کے علم آزادی کے نیچے آکر جمع ہو گئے تھے۔

گلاب چند

مطلوب ہیں

نگار جنوری ۳۷ء۔ نومبر ۳۳ء۔ جنوری و اپریل تا ستمبر۔ نومبر و دسمبر ۳۴ء۔ جون ۳۵ء۔ مئی و اگست ۳۶ء۔ فروری۔ دسمبر ۳۷ء کے نگار کے پرچے جو صاحب علٰحدہ کرنا چاہیں۔ دفتر کو اطلاع دیں۔

مینجر نگار لکھنؤ

حکومت آصفیہ کی رواداریاں

(ہندو بھائیوں سے خطاب)

یہ مقالہ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر (یمین السلطنۃ) سابق صدر اعظم دولت آصفیہ کے تاثرات کا نتیجہ ہے جن کے خاندان کو دکن کے نظم ونسق میں عرصۂ دراز سے ایک ممتاز و نمایاں عنصری حیثیت حاصل ہے اور اسلئے ظاہر ہے کہ ان سے زیادہ رازداں وہاں کے حالات کا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

موصوف ایسی ذمہ دار ہستی کا اپنی ہی جماعت (ہندو) سے خطاب کرنا اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ اس مقالہ میں جو حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں ان کی صحت میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ سرزمین دکن میں آریہ سماجی شورش و پروپاگنڈا حقیقتاً ایک ایسا "عمل غیر صالح" ہے جس کو کوئی متمدن و امن پسند انسان برداشت نہیں کرسکتا۔

موصوف نے اپنے مقالہ میں بحث کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا ہے اور انفرادی و اجتماعی حیثیت سے جتنی آزادی وہاں کے ہندوؤں کو حاصل ہے ان سب کو ظاہر کرکے حکومت دکن کی طرف سے ایسا ڈیفنس پیش کیا ہے کہ اس آریوں کی طرف سے اس کا کوئی جواب دیا ہی نہیں جاسکتا۔

اسوقت دنیا کے امن وسکون کا سوال اقتصادی مشکلات کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے اور وہ شخص جسے ایکبار بھی دکن جانے کا اتفاق ہوا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ کم ازکم یہاں کے ہندو کو اقتصادی دشواری کی بنا پر ہنگامہ برپا کرنے کی وجہ کبھی نہیں پیدا ہوسکتی۔ رہی تمدنی و مذہبی رواداری سو اس کا ثبوت وہاں کے دولتمند ہندوؤں کی معاشرت اور مندروں کی جایداد موقوفہ سے ملسکتا ہے، جن کا ذکر موصوف نے بھی اس مقالہ میں کیا ہے۔ بہرحال یہ مقالہ ہر لحاظ سے نہایت برمحل چیز ہے اور ہمیں امید ہے کہ بیرون حیدرآباد کے وہ ہندو جو کہ اس تحریک بدامنی کے بانی ہیں اسکا بغور مطالعہ کریں گے اور مذہبی عصبیت کے لایعنی جوش سے متاثر ہوکر حالات کو اس حد تک نہ پہونچنے دینگے کہ آخر کار خود انھیں بھی تاسف کرنا پڑے۔

(اڈیٹر)

میں ایک مدت سے اپنے آبائی وطن میں اُس سیاسی کشمکش کو گہری نظر سے دیکھ رہا ہوں جو ملکی امن و آسایش

کی حریف بن کر روز بروز ایک نئی صورت اختیار کرتی جارہی ہے اور جس کی وجہ سے ممالک محروسہ سرکار عالی کی ہموار اور پرامن سطح پر بھی بے چینی سی محسوس ہونے لگی ہے۔ میں ان ناخوشگوار حالات پر ایک خادم ملک اور وابستۂ دامنِ دولت آصفیہ کی حیثیت سے بہت قبل اظہارِ خیال کرنا چاہتا تھا لیکن طبیعت کے اضمحلال کی وجہ سے اس کا موقع اب مل سکا۔

یہ امر بے نیاز تشریح ہے کہ حیدرآباد کی سیاسی بے چینی اُن ہنگاموں کی صدائے بازگشت ہے جو بیرون ملک پیش آرہے ہیں اور جنھوں نے گو ابتداءً سیاسیات کے دامن میں آنکھ کھولی تھی لیکن رفتہ رفتہ فرقہ پرستی کی ناعاقبت اندیشانہ ذہنیت کی وجہ سے فتنہ پردازیوں میں تبدیل ہوگئے اور اس طرح تبدیل ہوگئے کہ حکومتیں بے چین ہیں رعایا پریشان ہے اور جانیں آئے دن خطرہ میں پڑتی جارہی ہیں اور ملک کے سچے بہی خواہ ہر جانب ماتم کررہے ہیں۔

بنیادی طور پر ہمارے ملک کو نہ ان سے کبھی پہلے تعلق تھا اور نہ اب ہوسکتا ہے۔ حیدرآباد کا دامن ہمیشہ سے اس قسم کی ہنگامہ آرائیوں سے پاک رہا ہے اور یہ ایک واقعہ ہے کہ اس سرزمین میں بسنے والے (ہندو مسلمان پارسی۔ عیسائی) ایک دوسرے کو برادرانہ محبت سے دیکھتے رہے ہیں اور اُن کے دل میں کبھی کوئی مخالفانہ احساس پیدا ہی نہیں ہوا۔

میرے آباؤ اجداد نے یہیں اطمینان کی سانسیں لیں اور یہیں میں (۷۵) سال سے عیش و راحت اور عزت و احترام کی زندگی بسر کررہا ہوں اور میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ رخنہ اندازیوں کے باوجود ملک کا کثیر حصہ اب بھی اپنے روائتی حسن سلوک پر عامل ہے۔

دکن آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے اسلامی بادشاہوں کے زیر نگیں رہتا آیا ہے لیکن کیا کوئی عادل شاہیوں کے عدل پر حرف لاسکتا ہے، بہمنیوں کی رواداری کا ثبوت اس سلطنت کے بہمنی لقب سے ملتا ہے، اسی طرح کیا کوئی بریدیوں کے حسن سلوک سے انکار کرسکتا ہے اور قطب شاہی عہد حکومت میں تو "اکنا و نادنا" کے سیاہ و سپید کے مالک ہونے کا واقعہ زبان زدِ عام ہے، یہی حال آصفجاہی سلطنت کا ہے جس کے ہر گوشہ میں مختلف اقوام ہر قسم کی آزادیوں کے ساتھ امن و اطمینان سے جی رہی ہیں۔

کیا اس کے باوجود کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہماری حکومت کے آئین مذہبی سطح پر رکھے گئے ہیں!! میں پوچھتا ہوں کہ ملک کے طول و عرض میں بسنے والوں کو آخر تکلیف کیا ہے؟ کیا اُن کی جاگیریں ضبط کی جارہی ہیں۔ اُن کی جایدادوں پر غاصبانہ قبضہ کیا جارہا ہے، اُن کی تعلیمی حالت میں کوئی امتیاز رکھا گیا ہے اُنکی عبادتگاہوں پر کوئی قیود عاید کئے گئے ہیں، اُن کو ملکی خدمات میں حصہ لینے سے روکا گیا ہے۔ اُنکی عزت و آبرو خطرہ میں ہے۔ غرض کہ "ہندو مت" پر چلنے والوں کی وہ کونسی ایسی شکایت ہے جس کو حکومت نہیں سنتی۔

یا بادشاہ وقت وقت کی پیشگاہ سے اُن کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اگر کسی فرد کو کچھ کہنا ہے یا کوئی جماعت کچھ کہنا چاہتی ہے وہ پہلے میرے پاس تو آئے اپنا دُکھ تو بیان کرے۔ اپنی تکلیف تو ظاہر کرے۔ اگر میرے نزدیک اُنکی شکایت واجبیت پر مبنی معلوم ہوئی اور اُس میں تعصب و فرقہ پرستی کا کوئی شائبہ نہ پایا گیا تو میں براہ راست اپنے بادشاہ سے عرض کروں گا اور اُن کی جایز شکایتوں کو ممکنہ سعی سے دور کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دوں گا۔

میں اس موقع پر اس کے اظہار میں ایک شدید درد محسوس کرتا ہوں کہ حیدرآباد کی بدامنی کا الزام اُن لوگوں پر ہے جو اپنے کو دیدہ کا پیرو بتا کر ہندو مت کو بدنام کر رہے ہیں، جن کی معاشرت تو عام ہندوؤں سے ملتی جلتی ہے مگر اُن کے جدید اُصول مذہب عام انسانیت کے لئے وبال جان ہو رہے ہیں یہ لوگ مسلمانوں اور عیسائیوں کے اولوالعزم پیغمبروں کو کیا سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے انسانیت پر نہ معلوم کیسے کیسے احسان کئے ہیں اور انسانوں کو کس طرح انسان بنایا ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ یہ خود ہندو مت کے عظیم الشان اوتاروں کے خلاف بھی زہر اُگلنے میں کوئی تامل نہیں کرتے، میں پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی سناتن دھرمی اس کو گوارا کر سکتا ہے کہ آریہ سماجی کرشن اوتار کا نام بدتہذیبی سے لیں اُن کی زندگی کو بگاڑ کر پیش کریں اور بیہودہ الزامات لگائیں یہی بات اگر کسی مسلمان کی زبان سے نکلتی تو ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ آپ کیا کرتے پھر یہ کیا ستم ہے کہ ہماری غیرت قومی ان کے لغویات کو سن کر گویا تلخ گھونٹ سمجھتی ہے مگر منھ بنا بنا کر پی جاتی ہے۔

میں چونکہ ہندو دھرم کا نام لیوا اور مہاراجہ چندولال بکینٹھ باشی کا جانشین اور سناتن دھرمی ہوں اس لئے میری نگاہ شرم سے جھک جاتی ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ بعض سناتن دھرمی بھی در پردہ اس انسانیت سوز پروپیگنڈے میں اُن مذہبی مجنونوں کے بہکانے سے شریک ہو رہے ہیں جو اُن کے مذہبی قوانین سے بنیادی اختلاف رکھتے ہیں۔

سب کچھ سنتے بھی ہیں اور بجائے اس کے کہ اُن کی زبانیں بند کریں، اُن کی بدلگامیوں کو روکیں، اُن کے بھجنوں میں محو ہو کر اُلٹا اثر قبول کرتے جا رہے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ دکن کے مسلم اور ہندو اس سلطنت ابدمدت کے دو بازو ہیں جن میں کبھی اختلاف نہیں ہو سکتا اور اس کو دکن کی دنیا خوب جانتی ہے کہ یہاں کے ہر چھوٹے بڑے ہندو خاندان پر شاہان آصفیہ کی جو بے پایاں مراعات مبذول رہی ہیں اور جس طرح سے ہر فرد کے ساتھ رواداری برتی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود دکن میں کبھی اختلاف مذہبی پیدا ہی نہیں ہوا اور نہ حقوق طلبی کا اس طرح سے ہنگامہ برپا کیا گیا۔

بیرونی افراد ہمیں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہم دُکھ اور ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں خصوصاً جب میں نے بیرونی اخبارات میں یہ بیانات پڑھے کہ حیدرآباد میں ہندوؤں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا، وہ گھوڑے

پر نہیں بیٹھ سکتے، وہ سفید کپڑے نہیں پہن سکتے، اُن کو مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے، تو مجھے اس "سفید جھوٹ" پر ہنسی آگئی۔ بیرون ملک کے کھدر پوش آئیں اور دیکھیں کہ حیدرآبادی ہندو کس قدر سفید پوش ہیں جیسی صبا رفتار موٹریں ہم یہاں اُڑائے اُڑائے پھرتے ہیں وہ کہیں دوسری جگہ نظر نہ آئیں گی۔ آئین حکومت میں جو مساوات کا برتاؤ ہمارے ساتھ کیا جاتا ہے اس کی نظیر کسی دوسرے مقام پر نہیں مل سکتی۔ جس قدر مذہبی آزادی یہاں ہم کو حاصل ہے اُس کی گواہی منادر کے وہ دروازے دے سکتے ہیں جو عبادتوں کے لئے ہر وقت کھلے رہتے ہیں اور لاکھوں روپیہ سالانہ کی بڑی بڑی جاگیریں اُن کے منادر کے انتظام کے لئے بادشاہوں نے عطا کی ہیں۔ مذہبی رسوم (جاتراؤں) جو خالص ہندومت کے طریقہ پر ہوتے ہیں اس میں مسلمان بھی برادرانہ محبت کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور "رتھ کشی" کے موقع پر موجود رہتے ہیں۔

اگرچہ ان اُمور کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہ تھی لیکن چونکہ باہر والوں نے ان حقیقتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے اس لئے یہ ضروری تھا کہ ان باتوں کو کسی ہندو کی زبان قلم سے سنا جائے تاکہ یہ ذہنی مغالطے دور ہوں اس لئے میں نے یہ مختصر خاکہ اپنی وطنی زندگی کا پیش کیا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جو ہمارے صحیح حالات کا تصور بھی نہیں کر سکتے سمجھیں اور اپنی قدیم آنکھوں سے دیکھیں اور کوئی ایسا اقدام نہ کریں جس سے صدیوں کا خوشگوار عمل بدنام ہو۔

میں یہ سب کچھ امن کی دولت کھونے والوں سے کہنا چاہتا ہوں اُن سے کہنا نہیں چاہتا جنھوں نے باہر سے آکر یہاں کی پُرسکون فضا کو مکدر کیا ہے اور غلط و بے بنیاد پروپگنڈے کر رہے ہیں اور ہمارے ہر دلعزیز اور محبوب آقا کی فطری ہمدردی کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو انسان تو انسان جانور کی بھی تکلیف کو نہیں دیکھ سکتا، جو زخمی بکرے کو اپنی موٹر پر بٹھا لیتا ہے اور اُس کی مرہم پٹی کرتا ہے، جو گائے کو ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکتا، جو اونٹ کی قربانی کو برداشت نہیں کر سکتا، جو بلی کو لنگڑاتا دیکھ کر دواخانۂ شاہی میں اُس کا علاج کراتا ہے اور دودھ روٹی اُس کے لئے مقرر کرتا ہے، کن کن اوصاف کو گناؤں، اس کی ذات سراپا رحمت ہے اور اس کا محترم وجود سراپا برکت!

اس کے ہوتے ہوئے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ بعض اہل ملک کی سادہ فطرت بھی آریہ سماجیوں کی غلط بیانی سے متاثر ہوتی معلوم ہوتی ہے تو مجھے افسوس ہی نہیں صدمہ ہوتا ہے کہ انھوں نے واقعات کا مطالعہ کوتاہ نظری کے سایہ میں کیا ہے ان کو جاننا چاہئے کہ بیرونی اشخاص کو ہمارے اندرونی معاملات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے اور وہ ہمارے اُس آرام و آسایش کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے ہیں جو ہم کو واقعات کی اس دنیا میں اسوقت حاصل ہے اس لئے اگر یہ دیوانگی نہیں تو عقل کی خرابی ضرور ہے جس کی اصلاح وقت کا اولین فرض ہے

ہم کو چاہیئے کہ جو کچھ آئندہ پیدا ہونے والے نتائج پر غور کریں اور اُسوقت کو نہ آنے دیں جب ہمیں اپنے افعال و کردار پر ملامت کے سوا کچھ حاصل نہ ہو اور ہمارا مختل دماغ جواب دینے کے بھی قابل نہ رہے۔

میں حسباً و نسباً ہندو ہوں لیکن اسی اسلامی حکومت میں وہ تمام اعزاز مجھ کو عطا کئے گئے ہیں جو اسی اسلامی حکومت کے لئے مخصوص ہیں۔ اور یہ کیجئے کہ جو مراحم و الطاف مجھ پر اور میرے ہندو خاندان پر اب تک مبذول ہیں اُس پر مسلمان امرائے عظام بھی رشک کر سکتے ہیں اور کچھ آج ہی سے نہیں بلکہ دولت آصفیہ کی رواداری ابتدا سے عدیم المثال رہی ہے۔ جنھوں نے حیدرآباد کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ جہاں نواب سالار جنگ بہادر اور نواب خانخانان اور فخر الملک بہادر کے خاندان امیرانہ عزت و احترام کے ساتھ بستے ہیں وہیں چھتریوں کا نام لیوا کشن پرشاد، برہمنوں کی مالا جپنے والا۔ رائے رایان اور کایستوں کے نقش قدم پر چلنے والا شیوراج اور ایسے بہت خاندان حیدرآباد میں امیرانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ممالک محروسہ میں پھیلے ہوئے سمستان (جو چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی حیثیت رکھتے ہیں) آزادی کی زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔

غرض ممالک محروسہ میں اس قسم کے نفرت انگیز پروپگنڈے کوئی جگہ نہیں پا سکتے۔ ہماری حکومت ہماری ہے اور اُس جمہوریت کی نام نہاد حکومت کے مقابلہ میں جو امن شکنی کا درس دیتی ہے، جو معصوم بندگانِ خدا پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑتی ہے، جو انسانیت کے خون سے اپنی ہوس حکمرانی کی پیاس بجھاتی ہے جو نادان جہلا کو اُبھار کر اُس میں نفرت و حقارت کا بیج بوتی ہے۔ ہماری حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور نہ اُسکے خصوصیات کا اندازہ کر سکتی ہے۔ ہم صدیوں سے سلاطین آصفیہ کے زیر سایہ آرام و راحت کی زندگی گزار رہے ہیں اور آپس میں اس طرح شیر و شکر ہیں کہ ایسا نظارہ ہندوستان میں کسی دوسری جگہ نظر نہیں آسکتا۔

موجودہ حالات کے لحاظ سے مجھے غالباً یہ کہنے کا حق ہو گیا ہے کہ باہر کے افراد ہمارے پر معنی سکوت سے ناجائز فایدہ اُٹھانے لگے ہیں مگر اُن کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جب تک ہم میں انسانیت باقی ہے اور ہماری رگوں میں آصفجاہی نمک دوڑ رہا ہے اسوقت تک، وہ یہاں قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ ابنائے وطن کو نہ بیرونی لوگوں کے مشورے کی ضرورت ہے اور نہ مدد کی اور نہ ایسی سر رانگیزیوں میں پڑ کر اپنی زندگیوں کو تباہی کی دعوت دینا قرین عقل ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنے موجودہ حالات ہی پر غور نہ کریں بلکہ اُس پیشینی امن و سکون کا بھی جائزہ لیکر دیکھیں جس کی بنا پر اپنے پڑوسی ہندوؤں یا کسی قوم سے پیچھے نہیں رہے، اس لئے ہم کو چاہیئے کہ آیندہ سماجیوں کے داخلہ کو روکیں اور ان کے پروپگنڈوں پر کان بھی نہ دھریں، اُن سے ببانگ دہل صاف صاف کہدیں کہ ہم اپنے حقوق کی حفاظت خود کر لیں گے تمھاری مدد کی، ہم کو کسی وقت ضرورت نہیں ہے تم دریائے راوی میں طوفان پیدا کر لو مگر موسیٰ و عیسیٰ کے سنگم میں افتراق پیدا نہیں کر سکتے۔

ہماری صرف لفظوں کی غلامی اُن کی خطرناک آزادی سے بدرجہا بہتر ہے۔ اگر اس کو بیرون ملک کے باشندے غلامی سمجھتے ہیں تو اس پر ہزاروں آزادیاں قربان کی جاسکتی ہیں بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ اگر یہ غلامی ہے تو دنیا میں آزادی کا صحیح تصور کبھی پیدا ہی نہیں ہوا اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ دکن کی رعایا و پرایا اور بہی خواہان ملک فرمان مبارک مترشدہ ۲۴ ذیحجہ ۱۳۵۷ھ کو اپنے لئے دلیل راہ بنائیں اور ان اثرات کو زائل کرنے کی متفقہ کوشش کریں جن سے ملک کے امن وسکون کو صدمہ پہونچ رہا ہے۔ کیا وہ نہیں سنتے کہ بے نتیجہ ستیاگرہ کی جارہی ہے، کیا وہ نہیں دیکھتے کہ سڑکوں پر بے گناہوں اور غافلوں کو مارنے کے لئے بم رکھے جارہے ہیں۔ کیا اب اس سے کوئی ناواقف ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں ایسی آمیزشیں کی جارہی ہیں جن کو دھوکے سے کھالینے سے کوئی دنوں بے ہوش پڑا رہتا ہے اور کوئی جان دیدیتا ہے۔ اس کے علاوہ طرح طرح سے ملک میں بدامنی پیدا کرنے کی شرارت آمیز دھمکیاں دیجارہی ہیں۔ پمفلٹ پر پمفلٹ آرہے ہیں، اشتہاروں پر اشتہار تقسیم کئے جارہے ہیں، پوسٹروں پر پوسٹر لگائے جارہے ہیں اور کوئی ٹپہ ٹائپ شدہ خطوط سے خالی نہیں رہتا۔ آخر ہمارے ساتھ آریہ سماجیوں کی یہ ہمدردی کیوں۔ ہم اُن کی انسانیت سوز حرکتوں سے کسی نوع کے حقوق حاصل کرنا نہیں چاہتے اور وہ کون سے حقوق ہیں جو ہم کو اسوقت حاصل نہیں ہیں۔ کاشتکاری ہماری ہے۔ تجارت ہماری ہے۔ ساہوکارہ ہمارا ہے۔ پٹیل پٹواری ہم ہی ہیں۔ دیسکھ دیسیانڈیہ ہم ہی ہیں۔ وطن دار ہم ہی ہیں۔ غرضکہ زندگی کا کونسا ایسا شعبہ ہے جس پر ہم قابض نہیں ہیں اور ہم کو اگر کچھ مانگنا ہی ہے تو اُس سے مانگیں گے جس نے اب تک بے مانگے ہمیں بہت کچھ دیا ہے اور مانگنے پر بھی فیاضی سے عطا کیا ہے۔ ہم بیرون ملک کا کوئی احسان لینا نہیں چاہتے اور نہ ہم اُن کی مدد کے محتاج ہیں۔

گو حکومت اس بدامنی کو دور کرنے کے لئے موثر اور پُرامن تدابیر اختیار کررہی ہے اور اُس کے نزدیک یہ شورشیں پرکاہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ مگر وہ کانپور کی تازہ وحشیانہ غارتگری کو دکن کی سرزمین پر دیکھنا پسند نہیں کرتی اور نہ بنارسی گنگا میں جو تلاطم پیدا ہوا تھا وہ موسیٰ ندی کی پرسکون موجوں سے ٹکرانا چاہتی ہے اور نہ الہ آباد کی شورشوں کو حیدرآباد کی سرزمین پر دکھانا چاہتی ہے۔

ہندو بھائیو! کیا دھول پیٹھ کے ہنگامے سے کوئی سبق نہیں ملا؟ تم سوچو اور عقل کی روشنی میں سوچو۔ مذہب کی غلط تعلیم کا نتیجہ تعصب ہے اور تعصب عنوان ہے اقوام کی تباہی کا۔ اس لئے اگر ہندو بن کر دیکھو گے تو تمھیں مخمل بھی ٹاٹ سے کمتر نظر آئے گا اور اگر آزادانہ غور وفکر سے کام لوگے تو مجھے یقین ہے کہ خود تمھاری گردنیں شرم سے جھک جائیں گی کیونکہ حکومت نے کبھی اپنے کسی برتاؤ سے یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ ہم کسی غیر کے محکوم ہیں۔

حضرت اقدس و اعلیٰ کو اصلاحی و تعمیری اُمور کا جب خود خیال ہے تو ہم کو بے چین ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر بھی تو غور کرو کہ یہ اصلاحیں اُس وقت تک عملی جامہ کیونکر پہن سکتی ہیں جب تک ارشاد خسروی پر عمل نہ کیا جائے اور وہ یہ ہیں :۔

"ملک کی عمرانی ترقی اور امن و سکون رعایا کے حُسن سلوک اور حکومت کے ساتھ اشتراک پر منحصر ہے"

اب اور کیا چاہتے ہو خود تمھارے بادشاہ نے تمھیں حکومت کے ساتھ تعاون اور اشتراک کی دعوت دیکر اپنی رواداری اور اپنی رعایا سے ہمدردی ظاہر فرمادی۔ اگر عاقبت اندیش ہو تو بادشاہ ذیجاہ کے قدموں پر اپنی پیشانیاں رکھدو اور یہ یقین کرلو کہ تمھاری نجات اسی کے سایہ میں ہے۔

مجھے امید ہے کہ میرے ان اشارات پر میرے وطنی ہندو بھائی ٹھنڈے دل سے غور کریں گے اور بیرونی اثرات کا کوئی اثر ان کی صلح پسند فطرت قبول نہ کرے گی بلکہ اُس کو ٹھکرا کر رہے گی۔

مہاراجہ بہادر سر کشن پرشاد صاحب سابق صدر اعظم

ہندو شعراء و ادبا سے ضروری التماس

خاکسار الہ آباد یونیورسٹی میں جولائی ۱۹۳۸ء سے بحیثیت ریسرچ اسکالر زیر نگرانی محترمی پروفیسر جناب سید محمد ضامن علی صاحب ایم۔ اے صدر شعبہ اُردو کام کر رہا ہے۔ میرے ریسرچ کا عنوان "اُردو ادب میں ہندوؤں کی خدمات" ہے۔ اس کے اندر نہ صرف مختلف اصناف سخن میں ہندو شعراء کی خدمات کا ذکر کیا جارہا ہے۔ بلکہ زبان اُردو سے متعلق تمام ادبی شاخوں (مثلاً مضمون نگاری، ناول نگاری۔ مختصر افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری، تذکرہ نگاری و نیز تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، سائنس، ریاضی وغیرہم) میں خامہ فرسائی کرنے والے ہندو صاحبان کے مختصر حالات زندگی معہ اُن کی ادبی خدمات کے لکھے جارہے ہیں۔ شعرا کا ذکر بلحاظ مختلف دور اور مقام سکونت (دہلی۔ لکھنؤ۔ اکبر آباد۔ الہ آباد۔ پنجاب۔ بہار۔ دکن اور دیگر مقامات) کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ آپ حضرات کی عنایت سے یہ کتاب دور حاضر تک کے لئے ایک نہایت جامع و مکمل تذکرہ ثابت ہوگی اس لئے اُن ہندو حضرات کی خدمت میں جن کی ادبی خدمات کا ذکر بہار گلشن کشمیر، خمخانۂ جاوید کی مطبوعہ چہار جلد اور بہار سخن مولفہ بابو شیام سندر لال صاحب برق سیتاپوری میں ناکافی یا بالکل نہیں کیا جاسکا ہے۔ خاکسار بہ ادب ملتمس ہے کہ وہ برائے کرم اپنے، نیز اگر ممکن ہو تو اپنے زمانۂ حیات کے اُن گمنام ہندو شعرا کے جو اُنھیں معلوم ہیں۔ لیکن عوام کی نظروں سے اب تک پوشیدہ ہیں مختصر حالات زندگی معہ نمونۂ کلام (صرف بیس چیدہ اشعار یا دو تین نظموں کے چند منتخب ابیات یا بند) اور اپنی نیز اُن کی خود نوشتہ کتابوں کے نام معہ سن تصنیف تالیف یا ترجمہ کے خاکسار کے پاس ذیل کے پتہ سے جلد ارسال کرکے مرہون منت فرمائیں۔

گنپت سہائے سریواستو۔ ایم۔ اے ریسرچ اسکالر
اُردو ڈیپارٹمنٹ ۔ الہ آباد یونیورسٹی

مکتوبات نیاز

ہائے وہ زمانہ کہ

گل دیدمے و روئے کسے یاد کردمے!

اب تو ہر وہ چیز جو شگفتہ ہے، زخم ہی زخم نظر آتی ہے۔ عرفی کا یہ شعر تم نے سنا ہوگا:-

زمنجنیق فلک سنگ فتنہ می بارد

من ابلہانہ گریزم در آبگینہ حصار

اس سے اندازہ کرلو کہ اضطراب و سراسیمگی کا کیا عالم ہے۔ "دنیا میں سب سے زیادہ صبر کرنے والا سب سے زیادہ بے چین ہوتا ہے" اس کا علم تم کو نہیں ہو سکتا اور خدا نہ کرے یہ صبر آزما گھڑیاں تم پر آئیں میں شکوہ و شکایت کا عادی نہیں اس لئے میری خاموشی کو لوگ میرے اطمینان سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن یہ صرف مجھی کو معلوم ہے کہ اس استغنا کی کتنی بڑی قیمت مجھے ادا کرنا پڑتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ تم مجھے کیوں خط لکھتے ہو اور کیوں آگ لگا جاتے ہو۔ تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ گرمیاں شروع ہوگئی ہیں اور آپ سے گزر جانے کا زمانہ آنے ہی والا ہے، پھر تم یہ الزام کیوں اپنے سر لو کہ تمہاری وجہ سے مجھے گریبان پھاڑنا پڑا۔

ستارہ و فلک و بخت و روزگارے ہست!

جی ہاں دیکھا۔ کیا کہنا ہے آپ کے انتخاب کا، ماشاء اللہ!

دو عالم از اثر شعلۂ جمالش سوخت

دیکھئے کہیں آپ کے دست و بازو کو نظر نہ لگے!

سچ کہتا ہوں میں نے ایسے مجرمانہ قیافہ کا انسان آج تک نہیں دیکھا۔ حیرت ہے کہ ان میں آخر وہ کونسی بات ہے جس نے آپ کو اتنا گرویدہ کر لیا۔ صورت دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کا شاید اولین

نقش ناکام کچھ ایسا ہی رہا ہوگا۔ وہ چھوٹی چھوٹی اندر دھنسی ہوئی گول گول آنکھیں کہ کیا کوئی پرکار سے ایسا صحیح دایرہ کھینچ سکتا ہے، وہ "تنگی چشم حسود" رکھنے والی بھدی پیشانی۔ وہ رخسار و ابرو کی ہڈیوں کا افقی اُبھار، وہ ٹیبل لینڈ قسم کی چوڑی چکلی ناک، وہ بکی کلیجی کی طرح کالے کالے سطبر ہونٹ اور اس پر وہ دیمک خوردہ مونچھ اور داڑھی!

اللہ، اللہ چہ جمال ست بدیں بولعجبی!

معلوم ہوتا ہے کہ انحناءِ خطوط اور اعوجاجِ زوایا کی کوئی ایسی بدنما شکل نہیں ہے جو حضرت کی تعمیرِ سراپا میں صرف نہ ہوئی ہو — کیوں پاگل ہوئے ہو۔ مانا کہ سیرت کے اعتبار سے وہ جنید و شبلی سہی، (حالانکہ اس صورت کے ساتھ ان کے انسان ہونے ہی میں گفتگو ہے) لیکن بعیت و ارادت کوئی کونین کی گولی تو ہے نہیں کہ اس کا کھانا ضرور ہے خواہ وہ کتنی ہی تلخ ہو۔ جھکنا ہے تو کوئی قرینہ کا آستانہ دیکھ کر جھکو، مزبلہ پر سر ٹیک دینا کیا معنی۔

خورشید پرست شو نہ گوسالہ پرست!

بارے آپ نے یاد کیا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ برہم ہوگئیں اب کبھی نہ بولیں گی۔ لیکن میری سمجھی ہوئی کوئی بات بھی آج تک صحیح نکلی ہے جو یہ صحیح نکلتی اور سچ پوچھئے تو اسی امید پر جی رہا تھا — ڈرتا ہوں اُسوقت سے جب مجھے آپ کی محبت کا یقین آجائے کہ پھر تو آپ کی عداوت مسلّم ہے۔

آپ نے سیاحتِ کشمیر کا ارادہ کیوں کیا۔ وہاں شاید آپ کے جذبۂ خود پسندی کی داد پوری طرح نہ مل سکے گی۔ بدخشاں سے لعل آتے ہیں وہاں بھیجے نہیں جاتے۔ اور پھر قیامت یہ ہے کہ آپ تنہا نہیں جارہی ہیں۔ بے پردہ جارہی ہیں، بالکل میم بن کر جارہی ہیں اور یہاں یہ حال ہے کہ

با سایہ ترا نمی پسندم

(وہ سایہ نہیں جو آپ پہنتی ہیں بلکہ آپ کا ظل مراد ہے)

اب فرمایئے آپ کیا کہتی ہیں؟

گرامی عزیز

جایئے جایئے، سرزمین فراعنہ کی سیر کیجئے۔ اُس قطعۂ زمین کی جو روایاتِ عہد عتیق کا پس منظر رہا ہے جو کسی وقت قلوپطرہ کے حسنِ اضمی زار کی جولانگاہ تھا اور اب "غوازی" نازک اندام کی رقص گاہ ہے۔

کس قدر رشک آتا ہے آپ پر!

میں ہر چند آپ سے بہت دور ہوں گا، لیکن میرا دل اپنی ان تمام تمناؤں کے ساتھ جو اس افسونکدۂ اہرام و ابوالہول سے متعلق ہیں آپ ہی کے ساتھ ہوگا۔ کانل پانچ سال تک وہاں رہنے کے بعد آپ کی ذہنیت میں جو تغیر ہونے والا ہے، اس کا ابھی سے خیر مقدم کرتا ہوں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کس قدر جی چاہتا ہے کہ مصر میں ایک بار میرا آپ کا اجتماع ہو۔ لیکن

آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں؟

خارتگرِ ہوش!

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی

تم نے کیوں یاد دلایا کہ نہیں! بیشک میں تم تک پہونچ سکتا تھا لیکن اس کا کیا علاج کہ جسے دُنیا سوسائٹی کہتی ہے وہ میرے نزدیک افلاسِ ذہن کی آخری جائے پناہ ہے، اور تمہارا مرکز وہی سوسائٹی ہے۔ اس دعوت کا شکریہ، لیکن تمھیں نہیں معلوم کہ اب میں کس قدر ناکارہ وغیر دلچسپ ہوگیا ہوں۔ وہ شخص جو صرف اپنے آپ سے باتیں کرکے وقت گزارنے کا عادی ہوگیا ہو، بڑے خطرہ کی چیز ہے، اس لئے اس سے احتراز ہی بہتر۔ خدا حافظ

مولویت و ادبیت! معقول۔ ان دونوں کا اجتماع آج تک کبھی ہوا ہے کہ اب ہوگا۔ "رندِ سجادہ بدوش" تو ملسکتا ہے، لیکن "زاہدِ خرابات نشیں" کا میسر آنا دشوار ہے۔ میں بھی ان سے مل چکا ہوں۔ اس میں شک نہیں نہایت ذہین شخص ہیں، لیکن "درخورِ انسانیت" کس حد تک ہیں، اس کا تجربہ نہیں ہوا اور نہ کرنا چاہتا ہوں، نتیجہ معلوم!

دُنیا کا کوئی نظریہ ایسا نہیں جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو، لیکن یہ نظریہ حقایقِ ریاضی میں شامل ہے کہ اگر آپ اس سے انکار کیجئے بھی تو سنتا کون ہے؟

سال رواں کے لئے کوئی نئی اسکیم میرے سامنے نہیں۔ مجھے تو اب صرف یہ انتظار ہے کہ دیکھئے ہماری کشتی ڈوبتی کس طرح ہے۔ ڈوبنا محقق، ساحل تک نہ پہونچنا بالکل یقینی۔ پھر اس "تماشا مفت" کو کیوں ہاتھ سے دیا جائے۔ آپ نے دیکھا وہاں کیا ہو رہا ہے۔ برابر آپس میں مشورے ہو رہے ہیں اور ہم کو بنارس بھیجنا طے ہو چکا ہے، لیکن جب تک "جناح زندہ باد" کہنے والی ایک زبان بھی موجود ہے،

انسان کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنی زندگی کی فکر کرے۔ یہ بھی تاریخ کا ایک ہی واقعہ ہوگا کہ قوم کی قوم کو صرف ایک شخص نے تباہ کر دیا، گو اس "ایک شخص" کے لئے یہ فخر کم نہیں۔ کیا آپ کو اس میں کلام ہے؟

زمرۂ اہلِ یقیں را مستکری ؟

وہ اور ایسا آسانی سے پیچھا چھوڑ دیتے ؟

دل را بزور از کفِ دلبر گرفتہ ایم

مجھے تو ان کی وسعتِ اخلاق کے متعلق "اندیشہ ہائے دور و دراز" پیدا ہونے لگے ہیں۔ بے غرضی بھی ایک حد تک پہونچکر خود غرضی ہو جایا کرتی ہے۔ یہ بھی کوئی خلوص میں خلوص ہے کہ کمر نظر آنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگوں کو محبت کرنے کا بھی سلیقہ حاصل نہیں، دشمنی کا کیا ذکر کہ وہ تو بڑے مرتبہ کی چیز ہے

ایک بات البتہ ان کی بہت پسند آئی اور وہ یہ کہ اتنا آکسیجن میں نے کسی شخص کے اندر نہیں دیکھا۔ ان سے پھر ملنے کو جی چاہتا ہے، لیکن ابھی نہیں، ذرا اور زندگی سے بیزار ہو لوں!

آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علٰحدہ علٰحدہ خرید فرمائیں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں

نگارستان	جمالستان	ترغیباتِ جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب سہ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نو روپیہ

معرکۂ سخن	مکتوباتِ نیاز	اُردو شاعری	ہندی شاعری	میزانِ کل
سر ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بتیس روپیہ میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ